معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰؍روپے فی شمارہ ۱۲؍روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰؍روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس ۲۵ پونڈ یا چالیس ۴۰ ڈالر

بحری ڈاک نو ۹ پونڈ یا چودہ ۱۴ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰی، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۱۵ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع ماہ کے تیسرے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۱ ماہ ذی الحجہ و محرم الحرام ۱۴۲۳ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۰۳ء عدد

مقالات

وفیات

ادبیات

باب التقریظ و الانتقاد

شذرات

آہ! فاضل گرامی ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحلت فرما گئے

افسوس صد افسوس کہ وہ فرزند اسلام نہیں رہا، جس کی اذانِ توحید سے مغرب کی وادیاں گونج رہی تھیں اور ہزاروں نفوس ایمان و اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو رہے تھے، وہ سرچشمۂ ہدایت بند ہوگیا جس سے مریضانِ کفر و ضلالت شفایاب ہو رہے تھے، واحسرتا کہ دین و دانش کا وہ آفتاب غروب ہوگیا جس سے مشرق و مغرب دونوں ضیا بار تھے اور تاریکیوں میں بھٹکنے والے راہ یاب ہو رہے تھے، علم کا وہ بے کراں سمندر راکد ہوگیا جس سے اسلام کا درخت سرسبز و شاداب تھا، دریائے تحقیق کا وہ شناور اور غواص چلا گیا جو یورپ کے کتب خانوں میں اپنے آبا کی موجود کتابوں سے علم کے جواہر نکالتا تھا، وہ پیکرِ علم و فن روپوش ہوگیا جو ابر نیساں بن کر پون صدی سے موتی لٹا رہا تھا، حکمت و معرفت کا وہ مجمع البحرین دنیا سے رخصت ہوگیا جو مشرق کے علمی میخانوں سے بھی سرشار تھا اور مغرب کے میکدۂ حکمت سے بھی مخمور تھا، وہ ہستی نہیں رہی جس کے فضل و کمال کا سکہ بلادِ مشرق اور عالم اسلام ہی میں نہیں، یورپ و امریکہ میں بھی چل رہا تھا، حیف صد حیف اس ذات گرامی کا خاتمہ ہوگیا جس کا دماغ نادر معلومات کا خزینہ اور سینہ علوم نبوی کا سفینہ تھا، جس کا قلم دشمنان اسلام کی علمی خیانتوں اور عیاریوں کو بے نقاب کرتا تھا اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت و صداقت کو آشکارا کرتا تھا، آہ ثم آہ کہ وہ سراپا علم و تحقیق روپوش ہوگیا جو تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کے اولین مصادر اور مسلمانوں کے نایاب اور گم شدہ علمی اندوختوں کو ڈھونڈ نکالتا تھا، وہ وجود مقدس خاموش ہوگیا جس نے پیرس میں بھی آداب سحر خیزی نہیں چھوڑے، جس کی راسخ العقیدگی کو مغرب کے فسق و فجور نے اور پختہ کر دیا تھا اور فحاشی و معصیت کی طغیانی نے اس کے ایمان و یقین میں مزید اضافہ کر دیا تھا، وادریغا کہ وہ کامل الایمان اور راسخ العقیدہ غائب ہوگیا جس کے پائے استقامت و عزیمت کو کفر و الحاد کی بادِ صرصر کبھی متزلزل نہیں

کر سکی، جس کی متاعِ دین و تقویٰ کو حسن و عشرت کی جلوہ گاہیں غارت نہ کر سکیں اور جس کے دامن عفت و طہارت پر دنیا کی رعنائیاں اور دل فریبیاں کوئی داغ و دھبا نہ ڈال سکیں یعنی شہرۂ آفاق عالم و محقق، نامور مصنف و فاضل، اسلام کے جاں نثار و فدائی اور اس کے مخلص داعی و مبلغ، نکتہ داں سیرت نگار، دیدہ ور مورخ، اسلامی فقہ و قانون کے ماہر، علوم دینیہ میں یگانہ اور جدید علوم میں فخر روزگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۹۴ برس کی عمر میں ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ کو داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ و انا الیہ راجعون، جن کی پاکیزہ زندگی اور مطہر شخصیت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھی اور جو اس عہد کے ابن سعد و طبری، بلاذری و یعقوبی، ابن اسحاق و ابن ہشام، ابن اثیر و ابو الفدا اور شمس الائمہ سرخسی اور علامہ ابن عابدین تھے، ان کی موت سے عالم اسلام ویران ہوگیا، دنیائے علم میں خاک اڑنے لگی، اہل علم، اصحاب نظر اور محققین سراپا درد و حسرت بنے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں ؎

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگرے

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۶ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ/ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق ارکاٹ (مدراس) کے مشہور عالم قاضی بدرالدولہ کے خاندان سے تھا جو ایک شریف و معزز عربی النسل نوائطی خاندان کی شاخ تھا، ان کے خاندان کو پشتینی علمی و دینی وجاہت حاصل تھی، ڈاکٹر صاحب کے والد مفتی خلیل اللہ صاحب علوم دینیہ میں ممتاز تھے، اس طرح ڈاکٹر صاحب کا علمی و دینی شغف فطری ہی نہیں موروثی بھی تھا، جامعہ نظامیہ سے فراغت کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے فقہ و اصول فقہ میں ایم۔ اے کیا، پھر ایل۔ ایل۔ بی، ایل۔ ایل۔ ایم اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے بعد ان کی حوصلہ مند طبیعت نے جرمنی اور فرانس کا رخ کیا اور بون یونیورسٹی (جرمنی) سے ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات'' پر ڈی فل کی اور سوربون یونیورسٹی پیرس سے ''عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری'' کے موضوع پر ڈی لٹ کی سند لی، اس کے بعد وطن آکر جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الملکی کے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، سقوط حیدر آباد کے زمانے میں حیدر آباد سے گئے تو واپس نہیں لوٹے اور ۱۹۴۸ء میں فرانس میں پناہ گزیں ہوئے اور اورینٹل اسٹڈیز ریسرچ سینٹر کے وظیفے پر

پچیس برس گزارے، فرانس کے نیشنل سینٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے بھی بیس سال تک وابستہ رہے، اس کے بعد پیرس ہی میں رہ کر تحقیق و تبلیغ اور اسلام پر مختلف زبانوں میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے اور یہی دراصل ان کی زندگی کا اصل مشن تھا، اس عرصے میں انہوں نے یورپ و ایشیا کی متعدد جامعات میں اہم موضوعات پر توسیعی خطبات دیے، اس سلسلے میں انقرہ، استنبول (ترکی)، کوالالمپور (ملیشیا)، قاہرہ (مصر) اور یورپ کے بعض ملکوں میں ان کے لکچر ہوئے جن میں اسلام کے بارے میں جدید ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کی آئین سازی اور نظام تعلیم کا خاکہ تیار کرنے میں بھی ہاتھ بٹایا جس میں بعض ممتاز علما کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی بھی شامل تھے، مگر جلد ہی ڈاکٹر صاحب کو حکومت کی بدنیتی کا اندازہ ہوگیا تو وہ اسلامی نظریاتی کونسل سے الگ ہوگیے، ڈاکٹر صاحب کی حیات مستعار کا زیادہ حصہ پیرس میں تن تنہا گزرا، آخر میں طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اپنے بھائی کی پوتی سدیدہ شفق صاحبہ کے یہاں فلوریڈا (امریکہ) چلے گیے، بالآخر بہت مشغول علمی و تحقیقی زندگی گزار کر ۱۷ر دسمبر ۲۰۰۲ء کو خالق حقیقی سے جاملے، سدیدہ صاحبہ کے والد محترم اور ڈاکٹر صاحب کے برادرزادہ جناب عطاء اللہ صاحب کے خط ہی سے مجھے ان کی وفات کی دل دوز خبر ملی، ۱۸ر دسمبر کو جب ان کا جنازہ اٹھا ہوگا تو یہ غیبی صدا ضرور بلند ہوئی ہوگی کہ ؎

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد — من مگر شمعم چوں رفتم بزم برہم ساختم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مدت العمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، بحث و تحقیق کا ذوق ان میں فطری تھا اور تلاش و جستجو کی طرف ان کا طبعی میلان تھا، وہ فنانی العلم تھے، ان کی زندگی کا کوئی لمحہ جستجوے علم و تحقیق سے خالی نہیں گزرتا تھا، اس لیے جو کچھ لکھا وہ عالمانہ، محققانہ، بحث و تحقیق کا شاہ کار، محنت و جاں فشانی اور کدو کاوش کا نتیجہ ہے، ان کا تحریری سرمایہ وافر و متنوع ہونے کے باوجود جدت و ابتکار سے خالی نہیں، انہوں نے تصنیف و تالیف میں اپنی راہ الگ نکالی تھی، ان کا پسندیدہ موضوع سیرت نبوی تھا، اس سے بہتر ان کے نزدیک کوئی اور مشغلہ نہیں تھا، مگر ان کی تمام تصنیفات سیرت کے پامال، فرسودہ اور روایتی انداز سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں، اردو کی اکثر تصانیف اسی موضوع پر ہیں اور سب نرالی اور اچھوتی ہیں مثلاً رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی،

عہد نبوی میں نظام حکمرانی، عہد نبوی کا نظام تعلیم، عہد نبوی کے میدان جنگ، مکتوبات نبوی، امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی، اسلامی ریاست، سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام، عرب حبش تعلقات، اسلام کے قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں، ان میں معلومات کا جو خزانہ ہے اسے ڈاکٹر صاحب جیسا کثیر العلم، وسیع المطالعہ اور جویاے تحقیق ہی جمع کرسکتا تھا، ان کے بعض معلومات تو انکشاف کا درجہ رکھتے ہیں، اردو میں ایک اہم بالشان کتاب "خطبات بہاول پور" ہے، جو ۱۹۸۰ء میں بہاول پور یونیورسٹی میں کسی تحریری یادداشت اور نوٹ کے بغیر دیے گئے ۱۲ لکچروں کا مجموعہ ہے، ان میں قرآن، حدیث، فقہ، اصول فقہ و اجتہاد، قانون بین الممالک اور مملکت و نظم و نسق کی تاریخ، دین (عقائد، عبادات و تصوف) دفاع و غزوات، تعلیم، تشریع و عدلیہ، مالیہ و تقویم کے نظام اور تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی عمر بھر کے مطالعہ و تحقیق کا نچوڑ آ گیا ہے، جو بہت مدلل، پرمغز، بصیرت افروز اور عہد حاضر کے مذاق و رجحان کے مطابق ہے، ان خطبوں میں پیش کیے گئے حقایق انکشاف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے اولیات میں شمار کیے جانے کے لایق ہیں، انہوں نے دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو انسائیکلوپیڈیا) لاہور کے لیے جو ۱۲۲ اہم مقالات لکھے ہیں وہ بھی ان کے علمی تبحر اور دینی بصیرت کے حامل ہیں، مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی کی دو کتابوں کے ترجمے، مقالات گارساں دی تاسی اور خطبات گارساں دی تاسی کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیے تھے، ڈاکٹر صاحب نے جب ان کا مقابلہ اصل فرانسیسی نسخہ سے کیا تو اس میں اغلاط نظر آئے، ان کے نظر ثانی کیے ہوئے، تصحیح شدہ نسخے کو مولوی عبدالحق صاحب نے جب انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع کیا تو ایک ایک جلد کی دونوں کتابیں دو دو جلدوں میں ہوگئیں۔

ڈاکٹر صاحب کو بنیادی اور اصلی مصادر و مآخذ کی تلاش و جستجو سے بڑی دلچسپی تھی، قدما کی نادر و نایاب کتابوں کو ڈھونڈ نکالنا اور ان کو ایڈٹ کر کے شائع کرنا ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، عربی زبان کی کئی بنیادی اور اہم کتابیں ان کی دریافت اور سعی و کوشش سے شائع ہوئیں، حدیث شریف میں صحیفہ ہمام بن منبہ کا مخطوطہ برلن سے حاصل کر کے اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ بیروت سے شائع کیا، سیرت کے ابتدائی مصادر میں مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی و

الخلافۃ الراشدۃ کو بھی بیروت سے شائع کیا، یہ عہد نبوی اور خلفاے راشدین کے دور کی تین سو سے زیادہ دستاویزوں پر مشتمل ہے، سیرت ابن اسحاق جیسے نایاب اور اولین ماخذ کو دریافت اور ایڈٹ کرکے رباط سے شائع کیا، مسلمانوں کے قدیم علم سیر کو قانون بین الممالک (انٹرنیشنل لا) کے طور پر متعارف کرایا، اس کی طرف فقہ کے ابواب السیر کی وجہ سے ان کی توجہ مبذول ہوئی تھی، امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی کتاب السیر الکبیر کو حیدرآباد سے انہوں نے طبع کرایا، امام ابوحنیفہؒ کے ایک اور شاگرد امام ابراہیم فزاری کی اسی موضوع کی ایک کتاب کا اس کی اہمیت کی بنا پر یونسکو نے ڈاکٹر صاحب سے فرانسیسی ترجمہ کرایا تھا، اس سلسلے کی اور کتابوں کے نام یہ ہیں انساب الاشراف بلاذری، کتاب الانواء ابن قتیبہ، کتاب الردہ ونبذۃ من فتوح العراق واقدی، الذخائر والتحف قاضی رشید بن زبیر، کتاب النبات ابوحنیفہ دینوری اور مقدمہ فی علم السیر یا حقوق الدول فی الاسلام فی احکام اہل الذمہ، نزھۃ المشتاق، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کے تین قدیم ترین نسخوں کا پتا لگا کر ان کا تقابلی مطالعہ کیا تھا، ان میں ایک تاشقند (ازبکستان) دوسرا استنبول (ترکی) اور تیسرا انڈیا آفس لائبریری لندن میں تھا، ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ تینوں ایک ہی قسم کے چمڑے پر ہیں، ترکی والے نسخے پر خون کے نشانات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ شہادت کے وقت اس کی تلاوت فرما رہے تھے، یہ نسخے کوفی رسم الخط میں تھے، ڈاکٹر صاحب نے سمرقند کے نسخے کو مصحف قرآن عثمانی کے نام سے جدید عربی خط میں نقطوں اور اعراب کے ساتھ مرتب کرکے فلاڈلفیا (امریکہ) سے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر حمید اللہ ایک دو نہیں درجنوں زبانیں جانتے تھے، اردو ان کی مادری زبان تھی لیکن فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالوی اور یونانی زبانوں پر بھی عبور تھا، فرنچ اور انگریزی میں اردو اور عربی ہی کی طرح متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، اسلام کی اشاعت وتبلیغ اور اس کے مخالفین کا جواب دینے کے لیے انہوں نے تصنیف وتالیف کے لیے خاص طور پر یورپین زبانوں کا انتخاب کیا تھا، سب سے مفید ومبارک کام فرنچ زبان میں ترجمۂ قرآن کی اشاعت ہے جس کے ۲۰ سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور کوئی ایڈیشن ۲۰ ہزار سے کم کا نہ تھا، اسلام کے تعارف کے لیے جو کتاب لکھی اس کے ۲۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمے ہوئے، دو جلدوں میں

سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی، دنیا کی ۱۲۰ زبانوں کے قرآنی تراجم کی ایک ببلوگرافی اور صحیح ترجمہ بوسکائی لصحیح البخاری تیار کی، پیغمبر اسلام کے چھ سیاسی خطوط فرنچ میں پیرس سے شائع کیا، اس کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، مختلف مذاہب کا اٹلس پیرس سے شائع کیا، روزے پر بھی فرنچ میں کتاب لکھی، فرنچ انسائیکلوپیڈیا کے لیے اسلامی موضوعات پر متعدد مقالے لکھے، انگریزی زبان میں بھی متعدد کتابیں تالیف کیں، ان کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے اور ہر تصنیف متعدد بار چھپی اور نہایت مقبول ہوئی، اس میں ان کی کدوکاوش اور محنت وتحقیق سے زیادہ ان کے حسن نیت اور خونِ جگر کا دخل تھا جس کے بغیر معجزۂ فن کی نمود نہیں ہوتی، تصنیف و تالیف سے ان کا اصل مقصد احقاق حق وابطال باطل، اسلام کا اثبات واظہار اور مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا جواب تھا اور یہ ان کے لیے اس بنا پر آسان تھا کہ ان کو اسلام کے اصلی مصادر کی طرح یورپین زبانوں سے بھی براہ راست واقفیت تھی، اس کی وجہ سے وہ مخالفین کے اعتراضات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور مدلل جواب دے کر انہیں قائل کردیتے تھے، چنانچہ ان کی کوشش سے ہزاروں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے، جن میں سفرا، پروفیسر اور معزز پیشوں سے وابستہ لوگ بھی ہوتے تھے، ان کی تصنیفات شایستہ، متین اور سلجھی ہوئی ہوتی ہیں، ان کی تحریر پُر مغز، سادہ، سلیس، عام فہم، دل نشین اور حشو وزوائد اور ایچ پیچ سے خالی ہوتی ہے، اس میں لفاظی، مبالغہ آرائی اور جذباتی لب ولہجہ نہیں ہوتا، بلکہ ہر بات مدلل ومربوط ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب مسلکاً شافعی تھے، مگر متعدد مسائل میں وہ بڑی بالغ نظری اور مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے تھے، ان جیسا صاحب علم ونظر کسی ایک ہی فقہی گروہ سے وابستہ نہیں رہ سکتا تھا، وہ تمام ائمہ اسلام کے فضل وکمال اور عظمت کے معترف تھے، امام ابوحنیفہؒ، ان کے اصحاب اور اس مسلکِ فقہ کے کبار علما واساطین کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں اور ان کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں تاہم اپنی تحقیق وجستجو اور دلائل سے جس کو صواب سمجھتے تھے اور جس پر ان کو شرح صدر ہوتا تھا اسی کو مانتے اور اختیار کرتے تھے، گہرے علم ومطالعہ کی بنا پر ان کے یہاں بعض تفردات بھی پائے جاتے ہیں، کیوں کہ رسوخ فی العلم والدین کی بنا پر ان کے لیے روایتی اور مروجہ طریقوں کو اختیار کرنا اور رسم ورہ آبا پر قانع ہوجانا ممکن نہیں تھا، اس میں مغرب سے مرعوبیت کو بھی دخل نہ تھا،

انہوں نے یورپ میں رہ کر اسلام کی جو عظیم الشان خدمت کی ہے وہ بڑے بڑے علما اور ادارے بھی نہیں کر سکے، ان کا عمل ہمیشہ عزیمت پر ہوتا تھا اور وہ اتباع سنت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے، ایک جرمن خاتون پردے کے اہتمام کے ساتھ ان سے ملنے آئیں مگر چہرہ کھلا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب دوسری طرف رخ کر کے ان سے باتیں کرتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے رہے، فوٹو کھنچوانے میں بھی محتاط تھے، ایک صاحب نے نکاح کی سنت پر عمل نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا میں سخت گناہ گار ہوں، خدا سے دعا کریں کہ وہ مجھے معاف فرمائے، میں یتیم تھا جب وقت تھا تو کسی نے توجہ نہ دی پھر جب میں نے علم کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو اس طرف توجہ نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ میری کوتاہی کی مغفرت فرمائے، میں ترکِ سنت پر سخت نادم ہوں، ڈاکٹر صاحب کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا، اردو کے مشہور اہل قلم اور ممتاز شاعر جناب جگن ناتھ آزاد جمہور نامہ کے نام سے دنیا کی منظوم تاریخ لکھ رہے تھے، اس کے ایک باب میں ظہور رسالت کا ذکر تھا جو معارف دسمبر ۱۹۵۹ء میں "ولادت باسعادت۔ ساقی نامہ" کے عنوان سے چھ صفحے میں چھپا تھا، ڈاکٹر صاحب عشقِ رسول میں سرشاری کی بنا پر اس کا فرنچ ترجمہ کرنا چاہتے تھے، اس کی اطلاع مجھے دی تو میں نے جگن ناتھ صاحب سے ذکر کیا، ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، ڈاکٹر صاحب کا پتا مجھ سے لے کر انہیں شکریے کا خط لکھا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی زندگی کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل کی عملی تفسیر تھی، ان کا وطن حیدرآباد تھا لیکن ریاست کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد علم کے غازی اور تحقیق کے مجاہد کو پردیس ہی میں رہنا پڑا، پیرس میں قیام کے باوجود نہ وہاں کی شہریت اختیار کی اور نہ کسی اور ملک کی نیشنلٹی ان کے پاس تھی، پیرس میں قیام عیش و عشرت کے لیے نہیں، علمی و تحقیقی اداروں اور کتب خانوں کی وجہ سے اختیار کیا تھا، ایسے ماڈرن شہر میں فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، دو کمروں کے جس فلیٹ میں رہتے تھے، وہ چوتھی منزل پر تھا، لفٹ نہیں تھی، کئی زینے طے کرنا ہوتا تھا، کمرے میں آسائش و زیبائش کے سامان کے بجائے کتابیں بھری ہوئی تھیں، اکیلے رہتے تھے نہ کوئی ملازم تھا اور نہ کوئی عزیز، سارے کام خود کرتے تھے، بازار سے سودا خود ہی جا کر لاتے، کھانا بھی خود پکاتے، غذا بہت سادہ تھی، حلال ذبیحہ ہونے کے باوجود ۳۰-۴۰ برس سے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا، اُبلی سبزی ترکاری، دودھ اور اس سے تیار کی گئی چیزیں، انڈے اور پھل ان کی خوراک تھی،

کپڑے بھی خود دھوتے تھے اور غالباً دو ہی ایک جوڑے کپڑے ان کے پاس رہتے تھے، ایک مرتبہ اسلام آباد گئے تو ان کا مختصر سامان دیکھ کر لوگ محو حیرت ہو گئے یعنی دو جوڑے کپڑے، ایک جوڑا جوتا، چند کتابیں اور رشتہ داروں کے لیے کچھ تحائف ع

سبک سار مردم سبک تر روند

سادہ زندگی ہی کی وجہ سے وہ ہمیشہ صحت مند، تندرست اور چاق و چوبند رہے اور اتنے سارے علمی کام کر ڈالے۔

زہد و اتقا، صبر و قناعت اور توکل و استغنا ان کا شعار تھا، ان میں حرص و ہوس کا کوئی شائبہ نہیں تھا، دنیا کے جاہ و اقبال، مال و دولت، شہرت و عزت اور نام و نمود سے ہمیشہ بے نیاز رہے، ایک صاحب ان سے انٹرویو لے رہے تھے تو وہ صرف علمی سوالات کا جواب دیتے تھے، اپنی ذات اور کارناموں سے متعلق سوالات کا کوئی جواب نہ دیتے، ان کی گوناگوں خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۴ء میں انہیں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا تو اسے لینے سے انکار کر دیا، کئی پاکستانی حکمرانوں نے بھی داد و دہش کرنی چاہی تو ان کا شکریہ ادا کر کے عاجزی سے معذرت کر دی، ان کی ساری کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ناشروں نے ان سے خوب کمایا مگر دولت سے بے نیازی کی وجہ سے وہ کتابوں کی رائلٹی نہیں لیتے تھے اور اگر کسی نے اصرار سے اس کے نام پر کچھ دیا تو اسے غربا، یتامیٰ اور بیوہ عورتوں میں تقسیم کر دیا، خوش اخلاق، نرم گفتار اور شگفتہ مزاج تھے، ان میں کبر و غرور اور رعونت نہ تھی، سادگی، تواضع اور عاجزی و فروتنی میں بے مثال تھے، ان کی تحریروں سے بھی ان کے اخلاص و انکسار اور طالب علمانہ تواضع و خاکساری کا پتہ چلتا ہے، خود تو کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا مگر دوسروں کی خدمت و تکریم کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کرتے، کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا تو اسے لینے کے لیے ہوائی اڈے پہنچ جاتے اور اس کے لیے بچھے رہتے، سیر و تفریح کراتے، وضع داری اور شرافت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

دارالمصنفین سے ڈاکٹر صاحب کا بہت پرانا اور گہرا تعلق تھا، شروع ہی سے وہ اس کے قدرداں اور بڑے کرم فرما تھے، علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے والہانہ تعلق رکھتے تھے،

اسی اخلاص اور محبت کی بنا پر ایک دفعہ حضرت سید صاحب سے ملنے کے لیے دارالمصنفین تشریف لائے تھے، ان کے بعد بھی اس سے ان کا مخلصانہ تعلق برابر قائم رہا، معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، اس میں ان کے مضامین اور خطوط بڑے فخر سے شائع کیے جاتے تھے، ایک مرتبہ میں نے ان سے مضمون کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ ''میں معارف کو دنیا کا سب سے بڑا رسالہ سمجھتا ہوں، جب کوئی چیز تیار ہوتی ہے تو پہلے اسی کو بھیجتا ہوں'' جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم ایک بین الاقوامی سمینار میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے، وہاں سے پیرس جانے کا اتفاق بھی ہوا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ملاقات سے محروم رہ جانے کا بہت افسوس تھا، لکھتے ہیں ''خواہش تھی کہ یہاں آکر دنیائے اسلام کے مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی بھی زیارت کروں، لندن سے ان کو ایک عریضہ بھیجا تھا کہ پیرس آکر ان کی دست بوسی کے لیے حاضر ہوں گا مگر ان کا خط موصول ہوا کہ میرا ان کے پاس پہنچنا مشکل ہے، اس لیے کہ ان کے یہاں ٹیلی فون نہیں اور وہ جس مکان میں رہتے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک سو بیس زینے چڑھنے ہوتے ہیں، اس لیے انہوں نے لکھا کہ میں جہاں قیام کروں وہاں وہ خود آجائیں گے، چند گھنٹے کے قیام میں کہیں ٹھہرنے کا سوال نہیں تھا، ٹیلی فون سے رابطہ ممکن نہ تھا، کچھ لوگوں کو ان کا پتا دکھایا وہ بتا نہ سکے اور کچھ بولے بھی تو ہم سمجھ نہ سکے، مایوس ہو کر ہوائی اڈے چلے آئے، ان سے نیاز نہ حاصل کرنے کا افسوس زندگی بھر رہے گا'' ڈاکٹر صاحب کی وفات دارالمصنفین کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے، وہ اس کے اور معارف کے علمی محتسب، مخلص کرم فرما اور بڑے ہمدرد تھے، وہ دنیا کے صف اول کے ممتاز علما و محققین میں تھے، اسلامی علوم پر اتنی وسیع و عمیق نظر رکھنے والے اب بہت کم لوگ ملیں گے، وہ بڑی خاموشی اور اخلاص سے علمی و دینی خدمات انجام دیتے تھے، بارالہا! تو اپنے اس مقبول بندے اور علم و دین کے خادم کی مغفرت فرما اور اسے بہشت بریں سے سرفراز کر اور اس کے اعزہ و متعلقین کو صبر و قرار نصیب کر! اللھم صب علیه شآبیب رحمتک واغفرله وارحمه یا ارحم الراحمین۔

گزشتہ شمارے میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے نئے وائس چانسلر پروفیسر عبدالوہاب کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے مگر ابھی وہ انچارج وائس چانسلر مقرر کیے گئے ہیں۔

مقالات

حضرت ام ایمن۔ رسول اکرم ﷺ کی انا

از پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ☆

(۲)

غزوۂ مریسیع ۵ھ/۶۲۷ء میں رسول اکرمؐ نے ایک اہم قبیلے بنو المصطلق کے خلاف فوجی کارروائی کی، اس کو مقامِ جنگ کے نام سے موسوم کر کے بالعموم غزوۂ مریسیع کہا جاتا ہے یا قبیلہ کی طرف نسبت دے کر غزوۂ بنو المصطلق کا نام دیا جاتا ہے، غزوہ سے واپسی کے سفر میں حضرت عائشہ ام المومنین پر بعض منافقین نے تہمت لگائی جس کا شکار بعض مسلمان بھی ہوگئے، مدینہ واپس آکر رسولِ اکرمؐ نے اس واقعۂ افک کی تحقیق فرمائی اور اپنے اہل بیت کے مردوں اور عورتوں سے مشورہ کیا، مردوں کے علاوہ خواتین میں حضرت بریرہ باندی سے پوچھا اور انہوں نے حضرت عائشہ کی برأت کی اور اسی طرح دوسری زوجۂ مطہرہ حضرت زینب بن جحشؓ نے حضرت عائشہؓ کے اعلیٰ کردار، پاک وصاف زندگی اور عفت وطہارت کی بہت خوبصورت گواہی دی، پھر رسول اکرمؐ نے حضرت ام ایمن سے دریافت فرمایا، ان کا جواب تھا: میرے کان و آنکھ محفوظ رہیں، میں نے ان کے بارے میں سوائے خیر کے نہ کچھ جانا اور نہ کچھ گمان کیا، ''ثم سأل رسول اللہ ﷺ ام ایمن فقالت: حاشی سمعی و بصری ان اکون علمت او ظننت بها قط الا خیرا"...... رسول اکرمؐ نے اہل بیت کے ایک متفقہ اظہار و اعلانِ برأت عائشہ صدیقہ کے بعد خطبہ عطا فرمایا، (واقدی ۲/ ۴۳۰-۴۳۱، بخاری، صحیح، کتاب المغازی باب حدیث الافک، مسلم، صحیح، کتاب التوبہ کے مطابق حضرت ام ایمن کے نوجوان فرزند اسامہ بن زید کلبی سے بھی آپؐ نے دریافت فرمایا تھا

☆ ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی، ریسرچ سیل ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اور انہوں نے حضرت عائشہؓ کے اعلیٰ کردار کی تصدیق کی تھی، نیز فتح الباری ۷/ ۵۳۸ - ۵۴۷:
.....فاما اسامة فاشار على رسول الله ﷺ بالذى يعلم من برأة اهله و بالذى يعلم لهم فى نفسه فقال : اهلک ولا نعلم الا خيرا ...... ''حضرت بریرہ سے استفسار حضرت علی کے مشورہ پر کیا تھا)۔

قیاس کہتا ہے کہ حضرت ام ایمنؓ اس غزوہ میں شریک تھیں اور دوسری خواتین اہل بیت بھی، جن سے رسول اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ کے کردار کے بارے میں تحقیق فرمائی تھی، روایات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے مرد صحابہ کرام اور خاتون صحابیات میں سے صرف مخصوص لوگوں سے ہی دریافت فرمایا تھا، نہ سب قریبی صحابہ سے اور نہ تمام اہل بیت و ازواج مطہرات سے، دوسرے جن سے تحقیقِ حال کی تھی ان میں سے مرد و خواتین میں سے بیشتر کی شمولیت کی تصدیق ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ واقعۂ افک ایک مخصوص مقام و موقع سے متعلق تھا لہذا اس غزوہ کے شرکاء سے ہی تحقیق حال منطقی لگتی ہے، ان وجوہ سے ان کی شرکت کا یقین ہوتا ہے۔

غزوۂ خیبر ۷ھ/۶۲۹ء

ابن سعد نے صرف ایک جملہ میں بیان کیا ہے کہ حضرت ام ایمن غزوۂ خیبر میں رسول اکرمؐ کے ساتھ شریک تھیں، اس کے علاوہ انہوں نے اس روایت کی کوئی تفصیل نہیں دی ہے جیسی کہ غزوۂ احد کے بارے میں دی ہے: (ابن سعد، ۸/۲۲۵'' ...... وشهدت خيبر مع رسول الله ﷺ''، ابن حجر، اصابہ، ۴/۴۱۶، واقدی، ۲/۶۰۰) واقدی نے بیان کیا ہے کہ اس غزوہ میں مدینہ سے بیس خواتین نے حصہ لیا تھا اور ناموں کی فہرست میں حضرت ام ایمن کا بھی نام لیا ہے۔

غزوۂ خیبر کے ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ ابن اسحاق کی سیرت میں ضمناً آگیا ہے، حضرت ام ایمن کے فرزند اکبر حضرت ایمن بن عبید خزرجی غزوہ خیبر میں شریک نہیں ہوئے اور وہ بنو عوف بن الخزرج کے ایک فرد و مرد کار تھے، (و کان قد تخلف عن خيبر ، وهو من بنى عوف بن الخزرج ، وكانت امه ام ايمن مولاة رسول الله ﷺ ......'' حضرت ام ایمن باوجود خاتونِ خانہ ہونے کے اس غزوہ میں شرکت کی تھی، ان کو فرزند کی بزدلی یا کوتاہی پر غصہ آیا اور انہوں نے فرزند کو سرزنش کی، حضرت حسان بن ثابت خزرجی نے حضرت ام ایمن کی خباب میں ان کے فرزند کی

طرف سے عذر پیش کیا اور چند اشعار میں اس کو ڈھال دیا:

علىٰ حين ان قالت لايمن امه ‌ ‌ جُبُنْتَ ولم تشهد فوارس خيبر
وايمن لم يجبن ولكن مهره ‌ ‌ اضَرَّبه شرب المديد المخمر
ولولا الذى قد كان من شان مهره ‌ ‌ تقاتل فيهم فارسا غير اعسر
ولكنه قد صده مغرا مهره ‌ ‌ وما كان منه عنده غير ايسر

ابن ہشام کا تبصرہ ان اشعار پر یہ ہے کہ ابوزید نے یہ اشعار حضرت کعب بن مالک کے بطور ان کو سنائے تھے، (ابن ہشام ۳/۴۰۱-۴۰۲، واقدی ۲/۶۸۴ نے حضرت ایمن بن عبید خزرجی کے علاوہ اس غزوہ میں شرکت نہ کرنے والوں کے نام گنائے ہیں، روایت میں یہ دلچسپ اور اہم اضافہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان پیچھے رہ جانے والوں کو بھی حصہ عطا فرمایا تھا)

دوسرے غزوات میں حضرت ام ایمن کی شرکت خارج از امکان و بعید از قیاس نہیں ہے، خصوصاً اس روایت کے بعد کہ انہوں نے مجاہدینِ اسلام کو غزوۂ حنین کے موقعہ پر ثبات قدمی کی دعا دی تھی مگر اپنی تنگیٔ زبان کے سبب ''ثبت'' کو "سبت" بنا دیا تھا اور اس کا ذکر ان کی عربی زبان میں غلطی کے حوالے سے آتا ہے، واقعات کی تاریخی ترتیب تقاضا کرتی ہے کہ حضرت ام ایمن فتحِ مکہ اور غزوۂ حنین دونوں میں شریک تھیں، کیونکہ انہوں نے یہ دعا میدانِ جنگ میں جاتے وقت دی تھی، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اسلامی فوج کے ساتھ مکہ مکرمہ اور وہاں سے حنین گئی تھیں۔

سریۂ اسامہ بن زید

اپنی دنیاوی حیات طیبہ کے اواخر میں رسول اکرمؐ نے حضرت اسامہ بن زید کلبی کو سریۂ فلسطین کا امیر مقرر فرمایا، اس کا بنیادی مقصد رومیوں سے حضرت زید بن حارثہ کلبی کی شہادت اور ان کے رفقاء کی المناک موت کا انتقام لینا تھا، واقدی کے مطابق رسول اکرمؐ نے دوشنبہ ۲۶/صفر ۱۱ھ کو مسلمانوں کو ''غزوۂ روم'' کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا اور دوسرے دن منگل کو حضرت اسامہ بن زید کلبی کو بلا کر فوج کی کمان سونپی، اس کے ایک دن بعد ہی رسول اکرمؐ کی بیماری شروع ہوگئی اور اسلامی لشکر اپنی منزل کے لیے روانہ نہ ہوسکا۔

اس دوران لوگوں کو باتیں بنانے اور تنقید کرنے کا موقع مل گیا اور بعض حلقوں نے حضرت اسامہ کی امارت پر اعتراض کیا کہ وہ نوجوان اور غلام زادے ہیں اور اس سے قبل انہوں

نے حضرت زید کلبی کی امارت پر اسی طرح اعتراضات وارد کیے تھے، رسول اکرمؐ کو ان کی خبر لگی تو آپؐ نے حضرت زید اور ان کے فرزند حضرت اسامہ دونوں کی امارت اور امارت کے لیے ان کی لیاقت کی تصدیق کی اور اپنے خطۂ عالیہ میں معترضوں کے اعتراضات کو شد و مد سے رد فرما دیا اور فوج کی امارت پر ان کو برقرار رکھا، (بخاری، صحیح، کتاب فضائل الصحابہ، مناقب زید، مسلم، صحیح، فضائل زید بن حارثہ، نیز بخاری، صحیح، کتاب المغازی، باب بعث النبیؐ اسامۃ بن زیدؓ فی مرضہ الذی توفی، فتح الباری ۸/۱۹۰-۱۹۱، نیز ابن ہشام، ابن سعد اور واقدی وغیرہ کے ابواب سریہ اسامہ بن زید۔

حضرت ام ایمن جو نوجوان امیر لشکر کی ماں تھیں، رسول اکرمؐ کی خدمتِ عالی میں حاضر ہوئی اور درخواست کی کہ حضرت اسامہ کو لشکر گاہ میں قیام کرنے سے بچانے اور ان کی حالت سدھارنے کے لیے وقت عطا فرمایا جائے کہ موجودہ حالت میں وہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکیں گے، ان کا مقصد وہی تھا کہ ان کو امارت سے معاف کر دیا جائے لیکن آپؐ نے حکم فرمایا کہ لشکرِ اسامہ کو ضرور روانہ کیا جائے اور حضرت اسامہ کو لشکر گاہ کا حکم عطا فرمایا: ''...... و دخلت ام ایمن فقالت : ای رسول الله، لو ترکت اسامة یقیم فی معسکره حتی تتماثل، فان اسامة ان خرج علی حالته هذه لم ینتفع بنفسه، فقال رسول اللهؐ : انفذوا بعث اسامة...... '' (واقدی ۳/۱۱۱۹)۔

حضرت اسامہ اپنے لشکر گاہ سے روانہ ہونے والے تھے کہ ان کی والدہ حضرت ام ایمن کے قاصد نے ان کو اطلاع دی کہ حضورؐ کا وقتِ آخر آ گیا، لہذا وہ مدینہ اکابر صحابہ کے ساتھ لوٹ آئے، جن میں حضرت عمر اور ابوعبیدہ بن جراح شامل تھے، ''فبینا اسامة یرید ان یرکب من الجرف اتاه رسول ام ایمن . وهی امه . تخبره ان رسول اللهؐ یموت ...... '' (۱۱۲۰)۔

قیام مدینہ کے واقعات

۱۔ آنحضرت ﷺ کا ام ایمن کی زیارت کے لیے تشریف لے جانا　حضرت ام ایمنؓ کی زیارت کرنا اور ان کے گھر پابندی سے جانا رسول اکرمؐ کا معمول تھا، ابن اثیر اور دوسرے اہل سیر و سوانح کا بیان ہے کہ رسول اکرمؐ باقاعدہ ان کے گھر جا کر ان کی زیارت فرماتے تھے، ''...... وکان یزورها فی بیتها ...... '' (اسد الغابہ ۵/۵۶۷، حلبی ۱/۱۰۵، ۱۱۰، اصابہ ترجمہ ام ایمن)

بظاہر یہ زیارت مدنی دور سے متعلق معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو مطلق واقعہ اور مستقل سنت سمجھنا چاہیے، کیوں کہ حضرت ام ایمن حضرت زید بن حارثہ کلبی سے مکہ مکرمہ میں منسوب ہونے کے بعد ایک الگ مکان میں رہنے لگی تھیں، ان کے مقام و مرتبہ اور رسول اکرمؐ سے ان کے تعلق و ربط کی بنا پر آپؐ کے دوسرے اعزہ و اقربا، اور صحابہ بھی ان کی زیارت کو جایا کرتے تھے، ان میں حضرات شیخین، حضرات ابوبکرؓ صدیق و عمرؓ فاروق سب سے زیادہ نمایاں تھے، ''وقیل ان ابا بکر و عمر کانا یزورانها کما کان رسول الله ﷺ یزورها '' (اسد الغابہ ۵/۵۶۸)، ابن اثیر نے یہ روایت کلمہ ضعف کے ساتھ بیان کی ہے کہ وہ مجروح، کمزور یا غلط روایت ہے، لیکن یہ درست نہیں کیوں کہ اس کی تائید دوسرے مصادر کی روایات سے ہوتی ہے کہ صحابہ کرام بالخصوص حضرات شیخین ان کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، حیاتِ نبویؐ میں بھی اور رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد خاص طور سے امام مسلم نے حضرت ام ایمن کے فضائل پر ایک باب باندھا ہے جس میں واضح حدیث ہے کہ رسول اکرمؐ اکثر ان کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، ایک دوسری حدیث ہے کہ ایک بار تشریف لے گئے تو انہوں نے شربت پیش کیا مگر آپؐ نے واپس کر دیا تو حضرت ام ایمن غصہ سے آپؐ پر چلانے لگیں، تیسری حدیث میں حضرات شیخین کے جانے کا ذکر ہے...... (صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل ام ایمن، مسعود احمد، ۸۵۸، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''عن انس انطلق رسول الله ﷺ الی ام ایمن فانطلقت معه، فناولته اناء فیه شراب، قال : لا ادری اصادفته صائما او لم یرده فجعلت تصخب علیه و تذمر علیه ......'' (ابن حجر، اصابہ ۴/۴۱۶: فاقبلت تضاحکه ......)۔

۲۔ حجاب　حضرت ام ایمن کا تعلق اہلِ بیتِ نبوی سے تھا کہ وہ موالی نبوی ہونے کے سبب گھر والوں میں سے تھیں، رسول اکرمؐ اسی بنا پر ان سے محبت بھی فرماتے تھے اور ان کے لیے وہی پسند کرتے تھے جو اہلِ بیت کے لیے کرتے تھے، چنانچہ آپؐ نے ان کے لیے بھی حجاب کا حکم دیا تھا: ''...... عن النبی ﷺ قال : غطی قناعک یا ام ایمن '' (بلاذری ۱/۲۲۴)۔

۳۔ اقطاع / عطیۂ نبوی　امام بخاری اور امام مسلم کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے ہجرتِ مدینہ کے بعد مہاجرین کو انصار کے اصرار و محبت پر ان کے باغات میں شریک و سہیم بنا دیا تھا اور ان کو کھجور

کے درخت اور آراضی ہبہ کردی تھی، غزوۂ بنونضیر کے بعد رسول اکرمؐ نے مہاجرین کو یہودی آراضی سے قطائع (زمین کے عطیات) عطا فرمائے اور ان سے انصار کے باغات کے حصص اور ان کی آراضی ان کے مالکوں کو واپس کرادی، کچھ انصاری عطایا و آراضی پھر بھی مہاجرین و مہاجرات کے قبضہ وملکیت میں رہ گئی کیوں کہ ان کو نضیری آراضی سے زمین و جائداد نہیں ملی تھی، غزوۂ بنی قریظہ کے بعد آپؐ نے اس موہوبہ انصاری آراضی کو بھی ان کے اصل مالکوں کو واپس لوٹانے کا فیصلہ کیا ان میں ایک آراضی اور باغ کا حصہ حضرت انس بن مالک خزرجی کے خاندان کا تھا جو حضرت ام ایمن کے تصرف میں تھا، حضرت انسؓ کے گھر والوں کو جب رسول اکرمؐ کے ارادہ کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت انس کو خدمت نبوی میں بھیجا کہ وہ اپنے حصۂ باغ کی واپسی کی درخواست کریں، حضرت ام ایمن کو حضرت انس کے آنے کا علم ہوا تو وہ بھی فوراً جنابِ نبوی میں پہونچیں اور حضرت انس کی گردن میں کپڑا ڈال کر فرمانے لگیں کہ رسول اکرمؐ اپنا عطیہ ہرگز واپس نہیں کریں گے، رسولِ اکرمؐ نے ان کو زمین واپس کرنے کا حکم دیا لیکن وہ راضی نہیں ہوئیں، آخر کار آنحضرتؐ نے ام ایمن کو انصاری آراضی کا دس گنا یا اس کے مساوی دے کر ان کو راضی کرلیا......''، (صحیح بخاری، كتاب المغازی، باب مرجع النبی ﷺ من الاحزاب الخ، صحيح مسلم، كتاب الجهاد باب رد المهاجرين الى الانصار منائحهم ......، فتح الباری ۵۱۲/۷، ۵۱۳، نیز ابن سعد ۲۲۵/۸ مثل مسلم) ''عن انس قال: كان الرجل يجعل للنبی ﷺ النخلات، حتى افتتح قريظه و النضير و ان أهلی أمرونی أن آتی النبی ﷺ فأساله الذی كانو اعطوه او بعضه، و كان النبی ﷺ قد اعطاه ام ايمن، فجاء ت ام ايمن فجعلت الثوب فی عنقی تقول: كلا والذی لا اله الا هو، لا يعطيكم وقد اعطانيها، او كما قالت، و النبی ﷺ يقول: لک كذا، وتقول: كلا والله، حتى اعطاها، حسبت انه قال، عشرة امثاله، او كما قال''، (صحیح مسلم، اردو ترجمہ ۱۱۱۵/۲، ۱۱۱۶ میں دو حدیثیں اس مضمون کی ہیں، ابن حجر، اصابہ ۴۱۶/۴: بروایت بخاری و ابن سعد)۔

حافظ ابن حجر نے شارح مسلم امام نووی کے حوالے سے حضرت ام ایمن کے رویہ کی تشریح کی ہے کہ وہ اس عطیہ کو مستقل و تا ابد سمجھتی تھیں اور رسول اکرمؐ نے ان کی تالیف قلب اور

لحاظ محبت کی بنا پر ان کے خیال و گمان کی تردید نہ کی اور اپنی طرف سے ان کو عطا فرمایا، اتنا عطا فرمایا کہ وہ راضی ہوگئیں کیوں کہ وہ آپؐ کی انا تھیں۔

۴۔ نبوی تعلقِ خاطر لاڈ پیار کا ایک رشتہ بھی رسول اکرمؐ نے حضرت ام ایمن کے ساتھ استوار کر رکھا تھا، ایک بار وہ خدمتِ نبوی میں تشریف لائیں تو رسول اکرمؐ سے درخواست کی کہ ان کو ایک اونٹ برائے سواری عطا فرمائیں، آپؐ نے ازراہ مذاق فرمایا کہ میں آپ کو اونٹنی کے بچے پر سوار کروں گا، حضرت ام ایمن نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ میرا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا اور مجھے اس کی خواہش بھی نہیں، آپؐ نے فرمایا: میں تو آپ کو اونٹنی کا بچہ ہی دوں گا، رسول اکرمؐ ان سے اسی طرح مزاح فرماتے تھے اور مزاح میں بھی سچ بات ہی کہتے تھے، اس واقعہ میں یہ واضح ہے کہ تمام اونٹ اونٹنیوں کے بچے ہی ہوتے ہیں، (بلاذری ۲۲۴/۱)۔

۵۔ زبان کی رخصت حضرت ام ایمن حبشی تھیں اور غالباً عربی حروف میں سے بعض کے مخارج صحیح نہیں نکال پاتی تھیں اور ان کی زبان میں بھی کچھ گرہ تھی اسی بنا پر ان کو ''عسراء اللسان'' کہا گیا ہے، رسول اکرمؐ کے سامنے انہوں نے غزوۂ حنین کے موقعہ پر مسلمانوں کو ثبات قدمی کی دعا دی تو ''سبت الله اقدامکم'' کہہ دیا جس کا مفہوم کچھ اور ہوگیا، حضورؐ نے ان کو تنبیہ فرمائی اور خاموش رہنے کا حکم دیا، (ابن سعد ۲۲۵/۸)، حضرت اسامہ کے بارے میں بھی یہ روایت آتی ہے کہ وہ ''ث'' کی آواز کو ''س'' سے جدا نہ کر پاتے اور ''الثرید'' کو ''السرید'' کہتے تھے (بلاذری ۱/ ۳۰۳) لیکن اسی کے ساتھ ان کو رخصت بھی عطا فرمائی، وہ خدمت میں آتیں تو لاسلام کہتیں، غالباً وہ السلام علیکم واضح طور سے نہیں کہہ پاتی تھیں، لہذا رسول اکرمؐ نے جب ان کو ''سلام لا علیکم'' کہتے سنا تو اجازت عطا فرمادی کہ وہ صرف ''سلام یا السلام'' ہی کہہ لیا کریں، وہی ان کے لیے کافی ہے (ابن سعد ۲۲۴/۸)۔

۶۔ چرواہی رسول اکرمؐ کے پاس بہت سے مویشی تھے جو مختلف چراگاہوں میں رہتے تھے، وہ آپؐ کے ذاتی مویشی بھی تھے اور اسلامی ریاست کے جانور بھی ان میں شامل تھے، ان کی دیکھ بھال اور چرانے کے لیے متعدد چرواہے تھے، حضرت ام ایمن بھی ان میں سے ایک تھیں، بلاذری کے مطابق نبیؐ کے پاس سات دودھاری اونٹنیاں تھیں جن کو ام ایمن چراتی تھیں ''كانت للنبی ﷺ

منائح سبعة اعنز، ترعاهن ام ایمن" بلاذری نے ان کی تفصیل بھی دی ہے (بلاذری ۱/۵۱۳، ۵۱۴)۔

غالباً اسی خدمتِ نبوی کے حوالے سے مدتوں بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان امویؓ نے حضرت ام ایمن کے فرزند حضرت اسامہ بن زید کلبیؓ سے ایک گفتگو کے دوران فرمایا: اللہ ام ایمن پر رحم فرمائے، میں ان کو اب بھی گویا دیکھ رہا ہوں کہ وہ دونوں بکریاں / مویشی لے جارہی ہیں، اس پر حضرت اسامہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! وہ ہند یعنی حضرت معاویہ کی ماں سے بہتر تھیں اور زیادہ معزز بھی، حضرت معاویہ کو ان کے معزز تر ہونے پر تعجب ہوا اور اس کا اظہار کیا تو حضرت اسامہ نے سورۂ حجرات کی آیت کریمہ ۱۳ پڑھی: "إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ......" غالباً حضرت معاویہ نے اس سے اتفاق کیا تھا (بلاذری ۱/۴۷۵)۔

مویشی چرانے کی ایک روایت حضرت ام ایمن کے بارے میں اب تک مل سکی ہے اور وہ بھی مدنی دور کی، اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ مویشی چرانے کا کام انہوں نے صرف مدنی دور میں اور ایک آدھ بار کیا تھا اور حضرت اسامہ و حضرت معاویہ کے مکالمہ سے اس کام کی سماجی فروتنی اور ناپسندیدہ حیثیت کا اشارہ سمجھنا بھی اسی طرح غلط ہے، گھریلو جانوروں کا چرانا اور اجرت پر چرواہی کرنا دونوں کام عرب روایات میں سماجی طور سے مقبول و پسندیدہ تھے اور اشراف خاندانوں کے لڑکے، موالی اور باندیاں اور معزز افراد و اشخاص یہ کام کرتے تھے، دراصل یہ نبیوں والا کام تھا اور تمام انبیائے کرام کے علاوہ خود رسول اکرمؐ نے اپنے لڑکپن میں جانوروں کو چرانے کا کام کیا تھا، (بخاری، صحیح، کتاب احادیث الانبیاء، باب یعکفون علی اصنام لهم، فتح الباری ۶/۵۳۳، وما بعد، مسعود احمد، ۳، میں بخاری کا حوالہ کتاب، کتاب بدء الخلق ہے جو غلط ہے:" ......قالوا: أكنت ترعى الغنم؟ قال: وهل من نبي الا وقد رعاها"۔

۷۔تجہیز و تکفین کی خدمت خاندانِ رسالت کے ایک بزرگ و عزیز فرد ہونے کا سبب حضرت ام ایمن تمام دکھ سکھ کے واقعات میں ضرور شریک رہتی تھیں، یہ روایات کا قصور اور راویوں کی کوتاہی ہے کہ وہ مکی سماج اور مدنی معاشرے کے اجتماعی کاموں میں ان کی شرکت اور افرادِ خاندان کی خدمت میں ان کی سعادت کا بالعموم ذکر نہیں کرتے ہیں، البتہ بعض اہم واقعات کے ضمن میں ان کے کام، کارگذاری اور خدمت کا حوالہ آ جاتا ہے۔

۸ھ/۶۲۹ء میں رسول اکرمؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا، ان کو غسل دینے والوں میں رسول اکرمؐ کی دو ازواج مطہرات حضرت سودہ بنت زمعہ اور حضرت ام سلمہ کے علاوہ حضرت ام ایمن بھی شریک تھیں، راوی نے تجہیز و تکفین کرنے کی سعادت پانے والوں میں ان کو سرفہرست رکھا ہے، (بلاذری ۱/۴۰۰: "وتوفيت زينب بنت رسول الله ﷺ في سنة ثمان من الهجرة بالمدينة فغسلتها ام ايمن و سودة ......"۔

اس سے قبل ۲ھ/۶۲۴ء میں رسول اکرمؐ کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا انتقال غزوۂ بدر کے دوران ہوگیا تھا، رسول اکرمؐ جہاد میں شرکت کے سبب شریک نہ ہوسکے اور ان کی نمازِ جنازہ ان کے شوہر حضرت عثمان بن عفان اموی نے پڑھائی تھی، ان کو غسل دینے کا فریضہ صرف حضرت ام ایمن نے ادا کیا تھا، (بلاذری ۱/۴۰۱: "وتوفيت في ايام بدر وهي عند عثمان ودفنت بالبقيع وصلى عليها عثمان وغسلتها ام ايمن ......"، ۹ھ/۶۳۰ء میں رسول اکرمؐ کی تیسری دختر حضرت ام کلثوم کی وفات ہوئی تو غالباً ان کو بھی حضرت ام ایمن نے ہی غسل دیا تھا۔

مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تین سال قبل حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدی، اولین زوجۂ مطہرہ کا انتقال ہوا، کلبی وغیرہ راویوں کا بیان ہے کہ ان کو حضرت ام ایمن اور حضرت ام الفضل، رسول اکرم ﷺ کی چچی اور حضرت عباس کی زوجۂ مکرمہ نے غسل دیا تھا، ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی کہ تب وہ مسنون نہ ہوئی تھی، (بلاذری ۱/۴۰۶)، ان روایات کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ خواتینِ اہلِ بیت کی تجہیز و تکفین کے کاموں میں حضرت ام ایمن کی شرکت لازمی امر تھا۔

۸۔روایتِ حدیث حافظ ابن حجر نے بعض احادیثِ نبوی حضرت ام ایمن کی سند و روایت پر قدیم کتب سے نقل کی ہیں:۔

اول حدیث ہے کہ چور کا ہاتھ صرف ڈھال میں کاٹا جائے گا: "لا يقطع السارق الا في جنة" اس روایت کو مسندِ یحییٰ الحمانی اور حافظ ابونعیم نے اپنی سند سے نقل کیا ہے، اس کے مطابق عہدِ نبوی میں اس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم کے برابر سمجھی جاتی تھی، لیکن اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے: "......وفی سنده مقال"۔

دوسری طبرانی کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے مسجد سے حضرت ام ایمن کو مخاطب کر کے

فرمایا کہ اوڑھنی دے دو تو انہوں نے حائضہ ہونے کے عذر کو پیش کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے"...... قالت ام ایمن قال رسول الله ﷺ : ناولینی الخمرة من المسجد ، قلت : انی حائض ، قال : ان حیضتک لیست فی یدک ''۔

حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو منقطع بتایا ہے:''..... وھذا فیہ انقطاع'' (اصابہ ۴/۴۱۶) ؎

۹۔ مرض و وفاتِ نبوی ﷺ حضور پاک ؐ کی وفات ایک عظیم ترین سانحہ تھا اور آپ ؐ کا صحابۂ کرام نے اس کو اپنے اپنے تعلق اور نقطۂ نظر سے دیکھا تھا، اسی طرح آپ ؐ کی بیماری کا ردِ عمل اہل بیت اور صحابہ کرام پر الگ الگ ہوا تھا، لیکن صدمہ، تکلیف اور پریشانی یکساں طور سے سب کو ہوئی تھی، دوسرے اہل بیت کی طرح حضرت ام ایمن بھی صدمہ سے دو چار ہوئی تھیں اور شاید ان کا صدمہ اندوہ ناک تر تھا کہ انھوں نے آپ ؐ کو پہلے دن سے آخر تک اپنے بچے کی مانند پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا۔

ایک روایت ہے کہ رسول اکرم ؐ کی بیماری کے زمانے میں آپ کے پاس حضرت فاطمہؓ رونے لگیں تو آپ ؐ نے ان کو تسلی دی اور صبر کی تلقین کی، حضرت ام ایمن کو گریہ نے آلیا تو ان کو تسلی دی گئی اور رونے سے منع کیا گیا کیوں کہ آپ ؐ کو اختیار دیا گیا تھا اور آپ ؐ نے اللہ کے پاس کی چیز پسند فرمائی، حضرت ام ایمن نے کہا: میں اس بنا پر رو رہی ہوں کہ اب ہم سے آسمان سے وحی آنی بند ہو جائے گی (بلاذری ۱/۵۵۳)۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اکرم ؐ کی وفات کے بعد جب آپ ؐ کی تدفین کا معاملہ درپیش تھا تو حضرت ام ایمن نے رونا شروع کر دیا، ان سے پوچھا گیا: 'کیا آپ رسول اکرم ؐ پر آہ وزاری کر رہی ہیں'؟ فرمایا: میں اس بنا پر نہیں رو رہی کیوں کہ مجھ سے زیادہ دوسرا کوئی جاننے والا نہیں ہے جو یہ شعور رکھتا ہو کہ آپ ؐ دنیا سے بہتر زندگی کی طرف تشریف لے گیے ہیں، لیکن میں تو اس وجہ سے رو رہی ہوں کہ اب ہم پر آسمان کی خبروں کا دروازہ بند ہو گیا ہے، (بلاذری ۱/۵۶۷، ابن حجر، اصابہ نمبر ۱۱۴۵ بہ روایتِ مختلف)۔

امام مسلم نے یہی واقعہ حضرت ام ایمن کی زیارتِ شیخین کے حوالے سے بیان کیا ہے، رسول اکرم ؐ کے انتقال کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ان کے ہاں گیے تو حضرت ام ایمن رونے لگیں، شیخین کے سوال آہ وزاری پر انہوں نے یہی جواب دیا اور حضرات شیخین بھی اس پر رو پڑے (صحیح مسلم، **کتاب الجهاد ، باب فضائل ام ایمن** ، مسعود احمد ۸۵۸؛ "عن انس قال : قال ابو بکر بعد وفاة رسول الله ﷺ لعمر: انطلق بنا الی ام ایمن نزورها کما کان رسول الله ﷺ یزورها ، فلما انتهینا الیها بکت فقالا لها : ما یبکیک ؟ ما عند الله خیر لرسوله ﷺ ، فقالت ما ابکی ان لا اکون اعلم انما عند الله خیر لرسول الله ﷺ ولکن ابکی ان الوحی قد انقطع من السماء ، فهیجتهما علی البکاء فجعلا یبکیان معها" ابن حجر، اصابہ ۴/۴۱۶)۔

اولاد و احفاد

(الف) حضرت ایمن ابن عبید خزرجی حضرت ام ایمن کے ذکرِ خیر میں اوپر گذر چکا ہے کہ ان کے پہلے شوہر عبید خزرجی سے ایک فرزند حضرت ایمن تھے، وہ عہد نبوی میں جوان تھے اور ایک مشہور شہسوار تھے، روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدینہ ہی میں رہتے تھے کہ ان کا شمار بنوعوف بن خزرج کے انصار میں ہوتا تھا، انہوں نے بعض غزواتِ نبوی میں سرگرم حصہ لیا تھا اور بعض میں وہ شرکت سے محروم رہے تھے، غزوۂ خیبر میں ان کی غیر حاضری پر ان کی ماں نے ان کو نکیر و ملامت کی تھی اور شاعرِ مدینہ کو ان کی طرف سے عذر کرنا پڑا تھا، بالآخر وہ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے، ثبات قدمی دکھائی، رسول اکرم ؐ کی مدافعت کی اور شہادت کی دولت پائی، (ابن ہشام ۴/۷، ۹۲: فہرست شہدائے حنین میں حضرت ایمن بن عبید قریش اور بنو ہاشم کا شہید قرار دیا گیا ہے، واقدی ۳/۹۰۰، صابرین کی فہرست میں ذکر حضرت ایمن ۳/۹۲۲: شہدائے فہرست میں ذکر ایمن ابن عبید / ابن ام ایمن ......'' ۳/۹۰۲ دفاع نبوی میں)، ابن قتیبہ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ایمن کے ایک فرزند کا نام جبیر تھا: ''وکان لایمن ابن یقال له : جبیر'' (کتاب المعارف ۱۴۴، نیز ۲۳۹: میں ایک شعر نقل کیا ہے جس سے اور ابن ہشام کے منقولہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دختِ رز کے عاشق و متوالے تھے۔

امام بخاری اور دوسرے اصحابِ حدیث و سیر نے بعض احادیث و روایات ایسی بیان کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایمن بن ام ایمن / عبید خزرجی کی نسل چلی تھی، ان کے ایک

فرزند کا نام حجاج بن ایمن بن ام ایمن تھا، وہ انصار کے فرد تھے، وہ نماز میں ایک بار رکوع وسجود صحیح ادا نہیں کر سکے تو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ان کو نماز دہرانے کا حکم دیا، جب وہ دوبارہ نماز ادا کر کے جانے لگے تو حضرت ابن عمر نے ان کے بارے میں دریافت کیا، ان کی نسبت ونسب معلوم ہونے پر فرمایا ''اگر رسول اکرمؐ نے ان کو دیکھا ہوتا تو ان کو بہت پیار کرتے اور پھر انہوں نے حضرت ام ایمن کی اولاد سے آپؐ کی محبت کا ذکر بہت شد ومد سے کیا'' '' فقال ابن عمر : لو رای هذا رسول الله ﷺ لاحبه ، فذكر حبه و ما ولدته ام ايمن '' صحیح بخاری، كتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ ، باب ذكر اسامة بن زيد ، فتح الباری ۷/۱۱۲، ۱۱۴، ابن سعد ۸/۲۲۵۔

(ب) حضرت اسامہ بن زید کلبی دوسرے شوہر حضرت زید بن حارثہ کلبی سے حضرت ام ایمن کے دوسرے فرزند حضرت اسامہ بن زید کلبیؓ تھے، وہ ہجرتِ مدینہ سے دس گیارہ سال قبل مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تھے، ان کا سنۂ ولادت ۲ا/۱۱ء متعین کیا جا سکتا ہے، وہ حضورؐ پرنور کے فرزند عزیز کے فرزند دل بند تھے اور چہیتوں کے چہیتے، ان کو آپؐ کا پوتا بھی قرار دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ ان کے والد ماجد حضرت زید بن حارثہ کلبی رسول اکرمؐ کے متبنیٰ (لے پالک، گود لیے ہوئے بیٹے) تھے، مدتوں ان کو زید بن محمدؐ کہا گیا اور قرآنی حکم کہ متبنیٰ (ادعاءکم) کو ان کے باپوں کے نام سے پکارا، زید بن حارثہ کہا گیا، مصادر میں ان ''زید الحب'' محبوب نبوی اور حضرت اسامہ کو ابن الحب، فرزند محبوب کہا جاتا ہے، ان کے فضائل ومناقب پر پورے پورے ابواب کتب حدیث وسیرت میں ملتے ہیں، بلاشبہ وہ نوجوان صحابہ کرام میں عزیز ترین نبوی تھے، (بخاری، صحیح، كتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ ، باب مناقب زيد بن حارثة مولىٰ النبی ﷺ وقال البراء عن النبی ﷺ : انت اخونا و مولانا ، مسلم، صحیح، كتاب الفضائل ، فضائل زيد بن حارثة اور مختلف ابواب بخاری ومسلم جیسے كتاب الحج وغیرہ، باب ذكر اسامة بن زيد : ''.......اسامة بن زيد حب رسول الله ﷺ'' عن اسامة : انه ياخذه و الحسن فيقول : اللهم أحبهما فانی أحبهما......، مسلم، صحیح، كتاب الفضائل ، فضائل زيد بن حارثه اور مختلف ابواب جیسے كتاب الايمان ، كتاب الحج ، بلاذری ۱/۴۶۷-۴۷۳، ۴۷۳: زید الحب، ۱/۴۷۳، ۴۷۶: اسامہ بن زید، استیعاب، اصابہ، اسد الغابہ میں ان کے تراجم)۔

حضرت ایمن بن عبید خزرجی کے وہ ماں جائے بھائی تھے یعنی ماں کی طرف سے بھائی: احا اسامة بن زيد لامه ......حضرت اسامہ بن زید کی کنیت ابو محمد تھی، لڑکپن سے ہی وہ ایک ممتاز تیر انداز تھے، رسول اکرم ﷺ ان کا لاڈ پیار کرتے تھے، موالی رسول ﷺ سے ہونے کے سبب وہ اہلِ بیتِ نبوی میں شمار ہوتے ہیں، غزوات نبوی میں انہوں نے غزوۂ خندق سے شریک ہونا شروع کیا، وہ بعض سرایا میں بھی گئے اور حیاتِ نبوی کے آخری سریہ میں وہ امیرِ لشکر بنا کر فلسطین [illegible] گئے جب کہ ان کی عمر محض اکیس برس تھی، مرض ووفات نبوی کے زمانے میں انہوں نے ایک فردِ خاندان کی طرح خدمات انجام دیں [illegible]سلامی خلافت کے دوران ان کی خدمات قابلِ قدر تھیں، حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دوران ان کی وفات ہوئی اور مدینہ میں [illegible] کیے گئے، ان کی ذاتِ والا صفات ایک الگ مطالعہ کی مستحق ہے، ان کی نسل مدتوں چلی، ان [illegible] فرزند محمد بن اسامہ کا ذکر امام بخاری کی احادیث میں ملتا ہے، ابنِ حزم نے ان کے دو اور فرزندوں احسن اور زید کا ذکر کیا ہے، محمد بن اسامہ کے دو فرزندوں اسامہ اور عبد کے دونوں محمد نامی فرزند محدث تھے اور دوسرے اخلاف بھی، (ابن حزم اندلسی، جمہرۃ انساب العرب، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ۴۲۸، ۴۲۹، حضرت اسامہ کو ''حب رسول الله ﷺ'' کہا گیا ہے، بخاری، صحیح، كتاب المغازی ، باب بعث النبی ﷺ اسامة بن زيد الخ : وان كان لمن احب الناس الیَّ وان هذا لمن احب الناس الیَّ بعده)۔

وفات حضرت ام ایمن کی وفات کے ضمن میں دو طرح کی روایات ملتی ہیں، ایک کے مطابق رسول اکرم ﷺ کی وفات کے صرف پانچ ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا، یہ روایت ابن السکن نے سندِ صحیح کے ساتھ امام زہری سے نقل کی ہے، بقول حافظ ابنِ حجر یہ روایت مرسل ہے، یہی روایت ابن حجر نے فتح الباری میں نقل کی ہے اور دوسرے صاحبانِ علم نے بھی، ابنِ حجر (فتح الباری) کی ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''......و عاشت ام ايمن بعد النبی ﷺ قليلا'' (۷/۱۱۳)، ابنِ اثیر کے الفاظ ہیں: ''......ثم توفيت بعد ما توفی رسول الله ﷺ بخمسة اشهر و قيل بستة اشهر'' (اسد الغابة، ۵/۵۶۸)۔

دوسری روایت پہلی کے معارض ہے اور وہ حدیثِ طارق ہے جس کے مطابق ان کی

وفات شہادتِ فاروقی کے بعد ہوئی، ابنِ حجر نے اس کو موصول روایت قرار دیا، یہ اس بنا پر زیادہ قوی اور معتمد ہے کہ حافظ ابن مندہ وغیرہ نے اسی کو قبول کیا ہے، ابن مندہ کا اضافہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بیس دن بعد ان کا انتقال ہوا، اسی بنا پر واقدی کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے جس کے مطابق ام ایمنؓ کی وفات خلافتِ عثمانؓ میں ہوئی تھی ''قال الواقدی : ماتت ام ایمن فی خلافة عثمان ......'' (اصابہ ۴/۴۱۶، ۴۱۷)۔

ابنِ سعد نے یہی روایت اپنے الفاظ میں یوں بیان کی ہے: ''قال محمد بن عمر : توفیت ام ایمن فی اول خلافة عثمان '' (۸/۲۲۶)، بعض روایات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت تک وہ زندہ تھیں اور ان کی شہادت کے حادثہ پر انھوں نے گریہ وزاری کی اور تبصرہ بھی، کہ آج اسلام کی کمزوری کا دن ہے ''لما قتل عمر بکت ام ایمن ، قالت : الیوم وھی الاسلام '' (۸/۲۲۶)، یہ روایت واقدی کے علاوہ دوسرے راویوں کی ہے جو حضرت طارق بن شہاب سے مروی ہے اور اس کو حافظ ابن حجر نے اصابہ میں سندِ صحیح سے مروی قرار دیا ہے (اصابہ ۴/۴۱۶)۔

روایات کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ام ایمن نے خلافتِ شیخین کا پورا زمانہ پایا اور وہ ۲۳ھ/۶۴۴ء میں واصل بحق ہوئیں، یعنی رسول اکرمؐ کے لگ بھگ تیرہ سال بعد، ان کی عمر کا حوالہ اب تک کہیں نہ مل سکا، قیاس سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسّی ۸۰ سال سے اوپر ہی تھیں، کیوں کہ ان کے رسول اکرمؐ کی عمر شریف ترسٹھ ۶۳ برس کی ہوئی تھی۔

خاتمۂ بحث بہت کم ایسی شخصیات تھیں جن کو رسول اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کو شروع سے آخر تک دیکھنے، پرکھنے، برتنے اور آنکنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی جتنی آپؐ کی محبوب انا حضرت ام ایمن کو ملی تھی، بلاشبہہ رسول اکرمؐ کے بعض اعزہ و اقربا جیسے حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی کو ولادتِ مبارکہ کے قبل سے وفاتِ نبوی کے بعد تک انوارِ محمدی کا دیدار نصیب ہوا تھا مگر ان کا جلوہ و دیدار ذرا دور کا جلوہ تھا، حضرت ام ایمنؓ ان سب عزیزوں، قریبوں، رشتہ داروں اور جاں نثاروں سے بھی زیادہ قریب و عزیز تھیں۔

والدِ گرامی قدر جناب عبد اللہ بن عبد المطلب ہاشمی کی باندی ہونے کی وجہ سے حضرت

ام ایمن برکہ نے پہلے والدین ماجدین کو قریب سے دیکھا اور جانا تھا اور ان کے اکلوتے فرزند اکبر کو ان کی ولادت کے قبل سے پہچانا تھا، ولادت کے بعد سے ترسٹھ سال کی پختہ عمر تک رسول اکرمؐ کی پوری زندگی ان کی نظروں کے سامنے رہی تھی اور ہر وقت اور ہر آن ان کی نگاہوں میں حیاتِ نبوی کی کتابِ زریں کا ورق ورق الٹتا اور جھلملاتا رہتا تھا، کیوں کہ وہ آپؐ کی انا، دایہ، کھلائی، ماما، خدمت گذار، خادمہ، گود کھلانے والی (حاضنة) تھیں، ہر وقت دیکھ ریکھ، پرورش و پرداخت، پالن پوسن، نگرانی و خدمت گذاری کا محبت بھرا فریضہ انجام دیتی تھیں، انہوں نے رسول اکرمؐ کے بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی، ادھیڑ عمری اور پیری کے تمام ادوار دیکھے تھے، مکہ مکرمہ کے ترپن سال ان کی محبت بھری نگاہوں کے سامنے گذرے تھے، ان میں چالیس سال کا عرصہ بعثت سے پہلے کا بھی شامل تھا اور تیرہ سال کا نبوت سے سرفرازی کے بعد کا، اس میں تاکت خدائی کا زمانہ بھی تھا اور ازدواجی دور کا بھی، مکہ مکرمہ کے بعد بقیہ دس سالہ زمانۂ نبوی بھی ان کے سامنے گذرا تھا اور حیاتِ مدنی کے ایک ایک باب سے وہ واقف تھیں، بندگی و باندگی اور غلامی کے بندھن سے اگرچہ وہ نجات پاگئی تھیں، تاہم وہ ولاءِ نبوی اور تعلقِ محمدی کے رشتہ سے کبھی آزاد نہ ہوسکیں، شادی کے بعد ان کا اپنا گھر بار اور اپنی آل و اولاد تھی تاہم درِ نبوی اور بیتِ محمدی سے وہ کبھی الگ نہیں رہ سکیں، انہوں نے اپنے محبوب فرزند و رسول کو ہر آن و ہر رنگ میں بہت قریب سے اور انتہائی محبت و عقیدت سے دیکھا پرکھا تھا۔

یہ راویوں، سیرت نگاروں، اخباریوں کی بدنصیبی اور کوتاہی ہے کہ ایسی ہمہ گیر و ہمہ جہت و ہمہ داں شخصیت سے رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے پل پل کی روایات نہیں حاصل کیں، بلکہ سرے سے استفادہ نہ کیا، کسی نے توفیق پالی ہوتی تو آج سیرت نبوی کے دفاتر کے دفاتر بشکل روزنامچہ جمع ہوگئے ہوتے اور ان کی بنیاد پر سیرت پوری کی پوری بلا کسی خلا و کوتاہی کے ہر دن اور ہر پل کی مرتب و مدون ہو کر عظیم ادب کا باعث بن جاتی، مگر تاریخ میں اگر مگر اور لیکن کی گنجائش نہیں، یہاں قضا و قدر کی طرح موجود و مبرم ہی حقیقت و واقعہ ہے، باقی گمان، بہر کیف ایک اور تاریخی واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت ام ایمن کی اپنی سوانح حیات پر بھی راویوں اور اہل سیر نے قرار واقعی توجہ نہیں دی، اوپر جو کچھ جمع کر کے پیش کیا گیا ہے وہ تنکہ تنکہ اکٹھا کر کے آشیاں بنانے کے

برابر ہے۔

ایک اور تاریخی حقیقت پوری بحث سے یہ ابھر کر سامنے آتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اولین برسوں سے متعلق ان کی سوانح حیات کا ایک سانحہ، ایک واقعہ اور ایک جزئیہ بھی ابھی تک کتب تذکرہ میں نہیں مل سکا، حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت ام ایمنؓ حضرت عثمان بن عفانؓ خلیفۂ سوم کے اولین دنوں تک زندہ رہیں اور ان کی خلافت راشدہ کے بیسویں دن ہی وہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھاریں، اس پورے تیرہ سالہ عرصۂ کارگذاری میں ان کا صرف ایک تبصرہ حضرت عمرؓ کی شہادت سے متعلق منقول ملا ہے، یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ خلافت صدیقی اور خلافت فاروقی کے بالترتیب ڈھائی سال اور ساڑھے دس سال کے عرصے کے دوران انہوں نے نہ کچھ دیکھا سنا ہو اور نہ کچھ کیا دھرا ہو، وہ ایک کارگذار خاتونِ عظمت و جاہ تھیں اور سب سے بڑھ کر وہ اہل بیت نبوی کا بقیہ نقیہ تھیں اور اس حیثیت سے ان کا ایک منفرد مقام و مرتبہ عالی تھا، پھر حضرات شیخین، ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ ان کے مقام قرب نبوی اور جاہ عالی سے بخوبی واقف تھے اور اسی بنا پر ان کی زیارت بلکہ زیارات کے لیے تا عمر آتے رہے تھے، اس لیے ان کا سوانحی خاکہ خاصا مالا مال رہا تھا اور اسلامی تاریخ کے اس دور میں ان کا عطیہ بھی گراں قدر رہا تھا، لہٰذا یہ عرصۂ سوانحِ حیات ایک اور تحقیقی مقالہ کا متقاضی ہے۔

سیرتِ نبوی پر راویوں و اخباریوں کی کوتاہ توجہی کے باوجود حضرت ام ایمن کی سوانح کا ایک حصہ بہر حال محفوظ ہو گیا اور وہ خالصتاً سیرت نبوی ہی کا عطیہ و فیضان ہے، ان کی زندگی کا سررشتہ اگر حیات نبوی سے اتنا مضبوطی اور گہرائی سے جڑا نہ ہوتا تو دستیاب معلومات کا حصہ بھی تدوین کی کوتاہی کا شکار بن جاتا، جیسا کہ خلافت راشدہ سے وابستہ زمانۂ حیات کے سوانح و واقعات کا حشر المناک ہوا، بہر کیف جتنی ''سیرتِ ام ایمن'' مل سکی ہے وہ ان کی شخصیت و صفات کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے، کم از کم عہد نبوی تک۔

برکہ حبشیہ ان حبشی نژاد غلاموں اور باندیوں میں سے ایک تھیں جن کو بردہ فروشی ان کے وطن حبشہ سے اکھاڑ کر مکہ مکرمہ لے آئی، جہاں حبشی غلاموں کی خاصی بڑی تعداد اکابرِ قریش کے گھروں میں چاکری کرتی تھی، ان کی خوش قسمتی کہ وہ جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی باندی

بنیں اور وہیں ان کو نبوی انا بننے کی سعادت ملی، ابن عبدالبر اور ان کی پیروی میں ابن حجر عسقلانی نے حضرت ام ایمن کا جو نسب نامہ بیان کیا وہ ان کے مدنی و خزرجی ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حبشہ میں ایسے نام ہوتے تھے اور نہ ایسے نسب نامے، بالخصوص عہد جاہلی کے ایام میں، ایک امکان یہ ہے کہ وہ بعض دوسرے عرب نژاد بچوں بچیوں کی مانند بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئی ہوں اور یثرب سے حبشہ میں لے جا کر فروخت کی گئی ہوں اور پھر وہاں سے مکہ مکرمہ ''حبشیہ'' بن کر واپس ہوئی ہوں اور وہ اسی طرح کی حبشیہ ہوں جس نوع کے حضرت صہیب نمری قاسطی صہیب رومی بن گئے تھے، لیکن یہ صرف قیاس ہے اور ان کی بنیاد ان کا مذکورہ بالا نسب نامہ ہے اور حضرت صہیب رومی جیسے عرب بچوں کی غلامی کی بنا پر جلاوطنی۔

جناب عبداللہ ہاشمی اور بی بی آمنہ کے گھر میں بسر ہونے والی زندگی کی روداد نہیں ملتی البتہ رسول اکرمؐ کی پرورش و پرداخت اور ''حضانت'' کے حوالے سے بعض واقعات کا ذکر ملتا ہے اور ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ والدہ ماجدہ کی زندگی میں اول روز سے آپؐ کی دیکھ بھال کرتی رہی تھیں اور تمام تر محبت و الفت اور دلی جذبے کے ساتھ کرتی تھیں اور شفیق و کریم دادا جناب عبد المطلب کی ہدایت کے بعد وہ جی جان سے اپنے فرائض انجام دینے لگی تھیں اور ماں کی وفات کے بعد انہوں نے تو ایک طرح سے ماں بن کر آپؐ کو پالا تھا اور یہ بسلسلۂ ''حضانت'' آپؐ کے بچپن و لڑکپن کے زمانے کے علاوہ جوانی کی عمر تک چلا تھا، اسی بنا پر رسول اکرمؐ ان کو اپنی ماں سمجھتے تھے اور زندگی بھر سمجھتے رہے اور اپنے خاندان کا فرد بھی سمجھا۔

روایات میں ذکر تو نہیں آتا لیکن یہ یقینی ہے کہ حضرت ام ایمن رسول اکرمؐ کے گھر میں ان کی ماں کی حیثیت سے پچیس سال کی عمر شریف تک رہیں اور حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا، تاہم وہ عرب روایات کے مطابق موالی (ولاء) کے رشتے سے آپؐ کے خاندان سے ہمیشہ وابستہ رہیں اور اپنی شادی تک بیتِ نبوی میں بھی رہیں، عبید بن عمرو خزرجی سے شادی کے بعد بھی وہ ایک فرد اہل بیت تھیں، قیامِ مکہ کے دوران ان کا رابطہ برابر قائم رہا اور مدینہ کے مختصر قیام کے دوران بھی آپؐ سے تعلق ٹوٹا نہیں تھا کہ آپؐ صلہ رحمی کے اعلیٰ ترین تعلق پر عامل تھے اور عرب روایت بھی یہی تھی، عبید خزرجی کی وفات کے بعد حضرت ام ایمن

کو اپنے گھر یعنی بیت نبوی واپس آنا پڑا اور رسول اکرمؐ کے سایے میں ان کی دوبارہ زندگی شروع ہوئی، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے نبوت کے بعد ان کی دوسری شادی حضرت زید بن حارثہ کلبی سے بنفس نفیس فرمائی، یہ دونوں موالیِ نبوی اور افراد اہل بیت کی زندگی بھی کی وابستگی ثابت ہوئی۔

دوسرے افراد اہل بیت کی مانند حضرت ام ایمن نے شروع ہی میں اسلام قبول کیا اور انہیں کی طرح مکہ مکرمہ میں تمام مصائب برداشت کیے اور انہیں کی طرح مدینہ منورہ ہجرت کی، ان کی ہجرت حبشہ کی روایت اس نئی گواہی کی بنا پر بھی غلط ہے، مدینہ منورہ میں وہ اہل بیت کی طرح رسول اکرمؐ سے ہمیشہ وابستہ رہیں اگرچہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں اپنی اولاد کے ساتھ رہتی تھیں، انہوں نے غزوات میں حصہ لیا اگرچہ واضح ذکر تو صرف احد اور خیبر کا ملتا ہے مگر قرائن کہتے ہیں کہ وہ سب غزوات میں نہ سہی بیشتر میں ضرور شریک رہی تھیں اور ان میں دوسری خواتینِ اہلِ بیت یعنی ازواج مطہرات کی مانند گراں قدر خدمات انجام دی تھیں، اس سے زیادہ ان کی خدمات رسول اکرمؐ اور آپ کے گھر والوں کے لیے وقف تھیں، ذکر تو صرف چند کا ملتا ہے مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ حضور اکرمؐ کی حیاتِ بابرکات اور اہل بیت کے تمام معاملات و امور میں ایک بزرگ خاندان کی طرح شریک و دخیل تھیں، شاید ان کی محبت و الفت کے سبب ان کے شوہر حضرت زید اور ان کے فرزند حضرت اسامہ اور دوسرے فرزند حضرت ایمن محبوبانِ نبوی میں سرِ فہرست تھے، حقیقی ماں تو آپ کو چھ سال کی عمر میں داغ دے گئیں مگر پرورش کرنے والی ماں نے زندگی بھر رسول اکرمؐ کے سر اقدس پر اپنا محبت بھرا دوپٹہ رحمت الٰہی کی مانند سایہ فگن رکھا تھا۔

حاتم الطائی اور اس کی شاعری

مولانا حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی ☆

ساتویں صدی عیسوی کے عربی شاعر حاتم الطائی کو شہرت اس کے غیر معمولی جود و سخا کی وجہ سے حاصل ہوئی، یہاں تک کہ اس باب میں وہ ضرب المثل کی حد تک مشہور ہوا، لیکن سخاوت و کرم کے علاوہ وہ ایک باکمال شاعر بھی تھا، لیکن تعجب ہے کہ سخاوت کے فسانے جتنے عام ہوئے، شاعری کا ذکر اتنا ہی مختصر اور محدود رہا، ادب عربی خصوصاً ادب جاہلی کے مطالعہ سے یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ مورخوں اور نقادوں نے ایسے باکمال شاعر سے قطعی اعتنا نہیں کیا، ڈاکٹر شوقی ضیف کی تاریخ الادب العربی میں حاتم طائی کا کہیں نام تک نہیں، حتیٰ کہ قضیہ انتحال کی بحث میں بھی اس کا نام نہیں حالانکہ اس کے اشعار میں الحاقات و اضافات بجائے خود ایک بحث ہے، ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی نے جرجی زیدان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیہ اور احمد حسن زیات کی تاریخ الادب العربی کی مدد سے ایک مبسوط تاریخ مرتب کی، اس میں بھی حاتم کا نام نہیں، محمد بہجۃ الاثری کی المجمل فی تاریخ الادب العربی جو اتنی مجمل بھی نہیں اس میں بھی حاتم کا ذکر مفقود ہے، ظاہر ہے اس کے بعد نصابی کتابوں میں اس کا نام کیسے آتا، چنانچہ سعودی عرب کے کلیۃ اللغۃ العربیہ کے سال اول کے طلبہ کے لیے الادب العربی و تاریخہ فی العصر الجاہلی نام کی ایک کتاب تیار کی گئی اس میں بھی حاتم نہیں، تعجب ہوتا ہے کہ جاہلی شاعری کی امتیازی خصوصیات یعنی غزل، فخر، حماسہ، مدح، مرثیہ، ہجو، اعتذار، سراپا اور حکمت و فلسفہ کی درجہ بندی میں اس کے ذکر سے گریز کیا گیا، حالانکہ فخر اور حکمت کے باب میں بہرحال اس کا نام غیر مناسب نہیں ہوتا، یہی نہیں جاہلی شعراء کے مشہور سات طبقات یعنی اصحاب المعلقات، مجمہرات، منتقیات، مذہبات، ملحمات وغیرہ میں اس کا نام

☆ رفیق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

نہیں رکھا گیا۔

لیکن یہ عموم استثناء سے خالی نہیں، چنانچہ حنا الفاخوری کی مبسوط و جامع کتاب الجامع فی تاریخ الادب العربی کے حصہ ادب قدیم کی فصل شعر الکرم والفروسیہ والحمیۃ کے ضمن میں حاتم طائی کا ذکر آہی گیا، اس کے علاوہ فاخوری نے شعر الحیاۃ و مناقب القبیلہ کے بیان میں اہم شعراء کی ایک فہرست میں حاتم طائی کا ذکر 'مثل الکرم العربی' کے عنوان سے کیا، ایک اور مقام پر اس لیے یہ بحث کی کہ کیف نشأ الشاعر ؟ شاعر کی نشو ونما کیسے ہوتی ہے؟ اس میں اس نے خاص طور پر حاتم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک شاعر قبیلے کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اونٹ، بکریوں اور سفر و حضر میں پرورش پاتا ہے، وادیوں اور گھاٹیوں کے علاوہ اس کے وجود کی خبر کسی اور کو نہیں ہوتی یا پھر اس کا پتہ ان کاروانوں سے ملتا ہے جو اپنے ساتھ افسانوں، قصوں اور واقعات کا انبار بھی لیے چلتے ہیں اور جن کی تفصیل سوائے اہل تحقیق و جستجو کے اور کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتی، جیسے ایک نوجوان نے دوشیزہ ماویہ کے نام کی تختی اپنے اونٹ کی گردن میں آویزاں کر رکھی تھی جس کی محبت میں نبیت بن مالک اور حاتم الطائی اس سے معرکہ آرا ہوئے، فتح آخر حاتم کی ہوئی، اس داستان میں حاتم کے اشعار خود اس کی شاعری کا ماخذ اور اس کے ماحول کا بہترین نمونہ ہیں۔

بعد میں حنا الفاخوری نے حاتم طائی کا ذکر مستقل علاحدہ عنوان سے کیا جو اگرچہ نسبتاً مختصر ہے لیکن اس قدر پرزور ہے کہ شوق کی عنان از خود حاتم کی حیات و شاعری کی جانب مڑ جاتی ہے، انھوں نے ایک جملہ لکھا کہ "وهكذا كان حاتم و جهامن اجمل الوجوه التى تمثل الروح العربية فى اصفى صفائها" یہ جملہ صرف حاتم کی شخصیت ہی نہیں اس کی شاعری کا حقیقی ترجمان ہے، ابن الاعرابی نے شاید اسی لیے کہا تھا کہ حاتم "كان جواد يشبه شعره جوده و يصدق قوله فعله"۔

حاتم طائی کے دیوان کے متعلق فاخوری نے لکھا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ مدح و فخر پر مشتمل ہے اور فخر کا زیادہ حصہ اس کے جود و کرم سے متعلق ہے، سخاوت اور داد و دہش اصلاً حاتم طائی کا مذہب وعقیدہ بلکہ زندگی تھی، اپنے دیوان کے قصیدہ رائیہ میں اس نے اس وصف کو مذہب حیات سے تعبیر کیا ہے، اپنی اہلیہ ماویہ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے اس کو فلسفہ حیات کا رنگ دیا، جس

کے مطابق مال و دولت بذات خود انسانی سعادت و شرف کا باعث نہیں، اس نے مال کو غاد و رائح کہہ کر اس خیال کو پرزور طریقے سے کمتر باور کرایا کہ دولت مروت و فتوت کا ایک ذریعہ ہوسکتی ہے، اس کا ایمان تھا کہ جب موت آتی ہے تو یہ دولت و ثروت کچھ کام نہیں آتی، باقی وہی رہ جاتا ہے جو انسانیت کی راہ میں خرچ کیا گیا:۔

أماوىَ، ان المال غادٍ و رائحٌ   و يبقىٰ من المال الاحاديث و الذكرُ

اماوى، انى لا اقول لسائل   اذا جاء يوماً : حلَّ فى مالنا نزرُ

اماوى، إمّا مانعٌ فمبينٌ   و إمّا عطاءٌ لاينهنهُهُ الزَّجرُ

اماوى، ما يُغنى الثَّراءُ عن الفتى   اذا حشرجت نفسٌ و ضاق بها الصدر

وانى لا آلو بمالٍ صنيعةً   فاوله زادٌ و آخره ذُخرُ

غنينا زماناً بالتّصعلُك و الغنى   كما الدهر فى ايامه العسرُ واليسرُ

فاخوری نے حاتم کے شاعرانہ امتیازات میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اس کی شاعری 'شدید اللصوق بشخصه' یعنی اس کی شخصیت سے مکمل ہم آہنگ پایہ کہ اس کا کامل پرتو تھی جس کی روشنی میں وہ نفسِ کریم کی عزت، غیرت، شرافت اور کرم کی تجلیاں دیکھتا اور محسوس کرتا تھا، وہ اپنے اشعار میں عفة فى الفقر اور اشتراكية فى الغنى کے فلسفہ کا علم بردار بھی نظر آتا ہے، فاخوری نے بجا طور پر کہا کہ حاتم کی شاعری چھوٹے قصائد و قطعات کی صورت میں ہے جن میں کہیں کہیں شعرائے جاہلیہ کا کھُس پنا (وعورہ) بھی ہے لیکن زیادہ تر اشعار میں تہذیب یافتہ زندگی کی نرمی اور سلیقہ موجود ہے، اس طرح حاتم اگر حاتم الکرم والجود ہے تو اس کی شاعری شعر السلاسة والكياسة بھی ہے۔

اس تمہید سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ حاتم طائی کی شخصیت کی طرح اس کی شاعری بھی نقادوں کی نظر اعتناء کی پوری مستحق ہے جس سے اس کمی کی تلافی ہو جس کا شکوہ ہم کو عربی ادب کے عام مورخوں اور نقادوں سے ہے، خوش قسمتی سے اس دوران میں ہماری نظر ایک عمدہ کتاب پر پڑی جس کا نام دیوان شعر حاتم بن عبداللہ الطائی واخبارہ ہے، اس کے لیے ہم اس کے محقق و مرتب حاشیہ و تعلیق نگار ڈاکٹر عادل سلیمان جمال کے مشکور ہیں جنھوں نے برٹش میوزیم، عراقی میوزیم

نہیں رکھا گیا۔

لیکن یہ عموم استثناء سے خالی نہیں، چنانچہ حنا الفاخوری کی مبسوط و جامع کتاب الجامع فی تاریخ الادب العربی کے حصہ ادب قدیم کی فصل شعر الکرم والفروسیہ والحمیۃ کے ضمن میں حاتم طائی کا ذکر آہی گیا، اس کے علاوہ فاخوری نے شعر الحیاۃ ومناقب القبیلہ کے بیان میں اہم شعراء کی ایک فہرست میں حاتم طائی کا ذکر 'مثل الکرم العربی' کے عنوان سے کیا، ایک اور مقام پر اس لیے یہ بحث کی کہ کیف نشأ الشاعر؟ شاعر کی نشو ونما کیسے ہوتی ہے؟ اس میں اس نے خاص طور پر حاتم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایک شاعر قبیلے کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اونٹ، بکریوں اور سفر و حضر میں پرورش پاتا ہے، وادیوں اور گھاٹیوں کے علاوہ اس کے وجود کی خبر کسی اور کو نہیں ہوتی یا پھر اس کا پتہ ان کاروانوں سے ملتا ہے جو اپنے ساتھ افسانوں، قصوں اور واقعات کا انبار بھی لیے چلتے ہیں اور جن کی تفصیل سوائے اہل تحقیق و جستجو کے اور کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکتی، جیسے ایک نوجوان نے دوشیزہ ماویہ کے نام کی تختی اپنے اونٹ کی گردن میں آویزاں کررکھی تھی جس کی محبت میں نبیت بن مالک اور حاتم الطائی اس سے معرکہ آرا ہوئے، فتح آخر حاتم کی ہوئی، اس داستان میں حاتم کے اشعار خود اس کی شاعری کا ماخذ اور اس کے ماحول کا بہترین نمونہ ہیں۔

بعد میں حنا الفاخوری نے حاتم طائی کا ذکر مستقل علاحدہ عنوان سے کیا جو اگرچہ نسبتاً مختصر ہے لیکن اس قدر پرزور ہے کہ شوق کی عنان ازخود حاتم کی حیات و شاعری کی جانب مڑ جاتی ہے، انھوں نے ایک جملہ لکھا کہ "وھکذا کان حاتم و جھامن اجمل الوجوہ التی تمثل الروح العربیۃ فی اصفی صفائھا" یہ جملہ صرف حاتم کی شخصیت ہی نہیں اس کی شاعری کا حقیقی ترجمان ہے، ابن الاعرابی نے شاید اسی لیے کہا تھا کہ حاتم "کان جواد یشبہ شعرہ جودہ و یصدق قولہ فعلہ"۔

حاتم طائی کے دیوان کے متعلق فاخوری نے لکھا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ مدح و فخر پر مشتمل ہے اور فخر کا زیادہ حصہ اس کے جود و کرم سے متعلق ہے، سخاوت اور داد و دہش اصلاً حاتم طائی کا مذہب و عقیدہ بلکہ زندگی تھی، اپنے دیوان کے قصیدہ رائیہ میں اس نے اس وصف کو مذہب حیات سے تعبیر کیا ہے، اپنی اہلیہ ماویہ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے اس کو فلسفہ حیات کا رنگ دیا، جس

کے مطابق مال و دولت بذات خود انسانی سعادت و شرف کا باعث نہیں، اس نے مال کو غاد و رائح کہہ کر اس خیال کو پرزور طریقے سے کمتر باور کرایا کہ دولت مروت و فتوت کا ایک ذریعہ ہوسکتی ہے، اس کا ایمان تھا کہ جب موت آتی ہے تو یہ دولت و ثروت کچھ کام نہیں آتی، باقی وہی رہ جاتا ہے جو انسانیت کی راہ میں خرچ کیا گیا:۔

أماویَ، ان المال غادٍ و رائحٌ و یبقیٰ من المال الاحادیث و الذکرُ

اماوی، انی لا اقول لسائل اذا جاء یوماً: حلَّ فی مالنا نزرُ

اماوی، اِمّا مانعٌ فمبیّنٌ و امّا عطاءٌ لایُنھنھہُ الزّجرُ

اماوی، ما یُغنی الثّراءُ عن الفتی اذا حشرجتْ نفسٌ و ضاق بھا الصدر

وانی لا آلو بمالٍ صنیعۃً فاولہ زادٌ و آخرہ ذُخرُ

غنینا زماناً بالتّصعْلُکِ و الغنی کما الدھر فی ایامہ العسرُ والیسرُ

فاخوری نے حاتم کے شاعرانہ امتیازات میں اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اس کی شاعری 'شدید اللصوق بشخصہ' یعنی اس کی شخصیت سے مکمل ہم آہنگ یا یہ کہ اس کا کامل پرتو تھی جس کی روشنی میں وہ نفسِ کریم کی عزت، غیرت، شرافت اور کرم کی تجلیاں دیکھتا اور محسوس کرتا تھا، وہ اپنے اشعار میں عفۃ فی الفقر اور اشتراکیۃ فی الغنی کے فلسفہ کا علم بردار بھی نظر آتا ہے، فاخوری نے بجا طور پر کہا کہ حاتم کی شاعری چھوٹے قصائد و قطعات کی صورت میں ہے جن میں کہیں کہیں شعرائے جاہلیہ کا گھس پنا (وعورہ) بھی ہے لیکن زیادہ تر اشعار میں تہذیب یافتہ زندگی کی نرمی اور سلیقہ موجود ہے، اس طرح حاتم اگر حاتم الکرم والجود ہے تو اس کی شاعری شعر السلاسۃ والکیاسۃ بھی ہے۔

اس تمہید سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ حاتم طائی کی شخصیت کی طرح اس کی شاعری بھی نقادوں کی نظر اعتناء کی پوری مستحق ہے جس سے اس کمی کی تلافی ہو جس کا شکوہ ہم کو عربی ادب کے عام مورخوں اور نقادوں سے ہے، خوش قسمتی سے اس دوران میں ہماری نظر ایک عمدہ کتاب پر پڑی جس کا نام دیوان شعر حاتم بن عبداللہ الطائی واخبارہ ہے، اس کے لیے ہم اس کے محقق و مرتب حاشیہ و تعلیق نگار ڈاکٹر عادل سلیمان جمال کے مشکور ہیں جنہوں نے برٹش میوزیم، عراقی میوزیم

اور یورپ کے کتب خانوں کی مدد سے دیوان حاتم کے نادر نسخہ کو دریافت کیا اور اپنے استاد اور مشہور فاضل علامہ محمود شاکر کی ترغیب سے اس کو ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی حیثیت دی اور پھر پندرہ سال کی محنت، دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے اس کو کامل و مرتب اور جامع شکل میں قاہرہ کے مطبع المدنی سے شائع کردیا، یہاں برٹش میوزیم اور عراقی میوزیم کے مخطوطات کا ذکر آیا ہے، مختصرا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عراقی میوزیم کے مخطوطہ میں اگرچہ کاتب کا نام اور سنہ کتابت مذکور نہیں لیکن اس کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چھٹی صدی ہجری کا ہے، خاص بات یہ ہے کہ یہ مصور بھی ہے، برٹش میوزیم کا مخطوطہ بھی مصور ہے اور اچھی حالت میں ہے اس میں کاتب ملا علی اور سنہ کتابت ۱۲۲۸ھ مذکور ہے، خیال ہے کہ کاتب نے اس نسخہ کو نسخہ عراق کی مدد سے نقل کیا، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دیوان حاتم طائی کے مطبوعہ نسخوں کی بنیاد یہی مخطوطہ ہے۔

مطبوعہ نسخوں کا ذکر آ گیا تو یہ لکھنا بھی مناسب ہوگا کہ سب سے پہلا مطبوعہ دیوان، لندن میں ۱۸۷۲ء میں رزق اللہ حسون نے شائع کیا، ۱۲۹۳ھ میں ایک اور دیوان قاہرہ سے امین عمر زیتونہ نے شائع کیا، اس کے بعد ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۷ء اور بعد میں یورپ اور عرب سے کئی بار طبع ہوا، خوشی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کو بھی دیوان حاتم کی طباعت کا فخر حاصل ہوا، ۱۸۷۸ء میں لاہور سے علامہ فیض الحسن سہارن پوری نے اس کو شائع کیا، ڈاکٹر عادل کو ہندوستانی نسخہ تو نہیں ملا لیکن انھوں نے باقی تمام نسخوں کی مدد سے متن کی تصحیح کی، حواشی اور تعلیقات کا اہتمام کیا، مراجعت اور تخریج کے صبر آزما مراحل سے گزر کر الحاقات و اضافات کا تعین کیا اس طرح ان کی کتاب اب تک کے مطبوعہ دیوان میں شاید سب سے کامل اور مستند حیثیت رکھتی ہے۔

دیوان حاتم کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ نسخہ دراصل ابوصالح یحیٰی بن مدرک طائی کا جمع کردہ ہے جس کو ابوالمنذر ہشام بن محمد بن السائب کلبی نے ان سے روایت کیا۔

لیکن خود ابن مدرک طائی کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، ابن قتیبہ نے اپنی کتاب المعارف میں معلمین کے باب میں ان کا ذکر ضرور کیا لیکن صرف اتنا کہ "المعلمون : **ابو صالح صاحب الکلبی**" ان کا زمانہ کیا تھا، صرف اندازے سے اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے اوسط تک موجود تھے کیوں کہ انھوں نے ابن الکلبی (م ۲۰۴)، ابوعمرو شیبانی (م ۲۰۶) اور اصمعی (م ۲۱۶) سے سماعت کی تھی۔

البتہ راوی دیوان ابن السائب کلبی کے متعلق کچھ معلومات ملتے ہیں کہ وہ ایک نامور اہل علم تھے، اپنے والد محمد بن السائب کلبی کے علاوہ انھوں نے ابن خیاط، ابن سعد اور ابن حبیب جیسے کبار علماء سے استفادہ کیا، وہ ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابوں اور رسالوں کے مصنف تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے علوم و معارف کا دائرہ وسیع اور روایت بہ کثرت تھی، ان کی جلالت علمی کے لیے اتنا کافی ہے کہ جاحظ، ابن سعد، طبری، مسعودی اور یاقوت حموی جیسے اساطین علم و ادب و تاریخ نے ان کی روایتوں پر اعتماد کیا اور نقل کیا، ابن کلبی کا انتقال ۲۰۴ھ میں ہوا۔

اس مختصر تعارف کے بعد ہم پھر حاتم کی جانب لوٹتے ہیں کہ اصل موضوع ان کی شاعری ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حاتم کی شاعری کو اس کی شخصیت کے پس منظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

حاتم بن عبداللہ بن سعد کی کنیت ابوسفانہ اور ابوعدی ہے، ان کے اور ان کے جد اعلیٰ طی کے درمیان بارہ واسطے ہیں، والد عبداللہ کا انتقال حاتم کی صغرسنی میں ہی ہوگیا، دادا سعد بن الحشرج کی آغوش میں ان کی پرورش ہوئی، جوان ہوئے اور جود و سخا میں غیر معمولی شہرت حاصل کی تو دادا سعد سے تعلق کمزور ہوگیا کیوں کہ وہ سخاوت میں حاتم کی حد سے زیادہ افراط کو برداشت نہیں کرسکے۔

ان کی والدہ غنیتہ بنت عفیف بھی نہایت سخی اور فیاض تھیں، کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس کرنا جانتی ہی نہیں تھیں، ان کی غیر معمولی سخاوت سے ان کے بھائی پریشان رہتے تھے، ان کے متعلق تذکرہ نگاروں نے صرف ایک واقعہ لکھا ہے کہ غنیتہ کو ان کے بھائی اکثر خاصا مال دیا کرتے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے یہ مالی امداد اس توقع میں روک دی کہ شاید ان کی بہن بذل مال سے باز آجائیں، ایک عرصے کے بعد بھائیوں نے پھر ان کو کچھ اونٹ دیے، اتفاق سے اسی موقع پر قبیلۂ ہوازن کی ایک عورت ان کے پاس آئی اور کچھ مدد کی خواست گار ہوئی، انھوں نے یہ سارے اونٹ اس کو دے دیے، قبیلہ طے کے لوگوں نے اسی لیے کہا کہ **ان حاتما اخذ عنها الجود**، حقیقت بھی یہی ہے کہ حاتم کو یہ صفت ان کی ماں کی آغوش تربیت سے ہی حاصل ہوئی۔

حاتم کے حالات میں ان کی بیوی ماویہ کا ذکر خاص طور پر آتا ہے، ان کے بعض اشعار کی وہ مخاطب بھی ہوئیں، کہا جاتا ہے کہ یہ حیرہ کی ملکہ یا ملوک یمن میں کسی کی بیٹی تھیں، حاتم سے ان کی

شادی کے متعلق کئی قصے ہیں جن کا ماحصل یہی ہے کہ ماویہ نے حاتم کی صفت بذل وکرم سے متاثر ہوکر ازخود اس رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا، حاتم کی خودداری نے اس آتش کو اور تیز تر کردیا، آخر کار وہ اپنی آرزو میں کامیاب ہوئی، حاتم کے قصیدہ ذرائیہ میں یہ شعر اسی کیفیت کا غماز ہے:۔

وانی لمرج للمطی علی الوجی　　وما انا من خلافک ابنة عفزرا

حاتم کی ایک اور بیوی کا ذکر بھی ملتا ہے یہ نوار بنت ثرملہ ہے جس سے گمان غالب یہی ہے کہ حاتم نے ماویہ کے بعد شادی کی، ان دونوں کی شادی، طلاق اور موت کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔ لیکن ان کا بیان یہاں ضروری نہیں، بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ انفاق مال اور بذل و کرم میں اگر ماویہ حاتم کی معاون تھی تو اس کے برعکس نوار کو یہ سب زیادہ پسند نہیں تھا بلکہ کبھی کبھی وہ حاتم کو اس باب میں ٹوکتی رہتی تھی۔

حاتم کی اولاد میں حضرت عدی مشہور صحابی ہیں، ۹ھ میں وہ اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے، رسول اللہ ﷺ اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد میں وہ کئی معرکوں میں بھی شریک رہے، ان کے سوانح سیر کی کتابوں میں تفصیل سے ملتے ہیں، ان کے اور ان کی بہن سفانہ اور ایک چھوٹے بھائی عبداللہ کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ان کی والدہ ماویہ تھیں لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ سب نوار کے بطن سے تھے، عدی اور سفانہ دونوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جود وسخا میں اپنے والد کا حقیقی عکس تھے، سفانہ کے متعلق تو یہ جملہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ اجود نساء العرب تھیں۔

حاتم کی پیدائش اور زمانہ حیات کے متعلق روایتیں واضح نہیں لیکن قرائن سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں پیدا ہوئے اور ساتویں صدی کی پہلی دہائی تک زندہ رہے۔

سماجی لحاظ سے وہ اپنے قبیلہ وقوم کے سب سے سربرآوردہ شخص تھے، اس وجاہت وسیادت میں ان کی شہرۂ آفاق صفت سخاوت کا بھی خاص دخل ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہترین شہسوار اور صاحب سیف بھی تھے، فزارہ، بکر بن وائل اور تمیم کے ساتھ ان کی معرکہ آرائی اور شجاعت وظفرمندی کی کچھ جھلکیاں تاریخ کے صفحات نے محفوظ بھی کر رکھی ہیں، لیکن یہ بات قابل

لحاظ ہے کہ دوسرے عرب شعراء کے برخلاف حاتم نے اپنی شجاعت، دلیری، فتح اور دشمن کی شکست وذلت کو اپنے اشعار میں کم جگہ دی، حاتم کی شخصیت کو سمجھنے میں یہ اشارہ بڑا واضح ہے کہ اصلاً حاتم کی ذات مکارم اخلاق سے عبارت تھی جو ہر طور شریف کی مداح اور شر وفساد کے ہر مظہر سے دور تھی، شاید اسی لیے یہ کہا گیا کہ "ما ترک شیئا محمودا الا اتاه وما رای امرا معیبا الا تحاشاه، فطر علی حب الخیر و اجتناب الشر"۔

چنانچہ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ اگر کرم، عطا، شرافت نفس اور جود وسخا پر مشتمل ہے تو اس پر حیرت نہیں، حیرت اس پر ہوتی ہے کہ عین اس دور میں جب کہ عربی شاعری فخر وحماسہ اور اس سے زیادہ نسیب وتشبیب کے پردہ میں تصنع اور مبالغہ آمیز فخر وتکبر اور اس سے بڑھ کر صنف لطیف کے اسرار کو عیاں کرنے میں مشغول تھی اور بقول ایک محقق ناقد "امرؤالقیس سے عمرو بن ربیعہ اور جمیل وقیس تک شاعروں کے دل کی دنیا صرف وجود اور تصور زن سے آباد تھی" ایسے میں حاتم جو خود بھی ماویہ کے تعلق سے واردات قلب کے تمام رموز سے واقف ہوچکا تھا، اس نے دل کی حکایتوں کے لیے اپنی زبان کا سہارا کیوں نہ لیا اور ہم عصر عربی شاعری کے عام مزاج ورویہ سے وہ گریزاں کیوں رہا، ماویہ اور نوار اس کی عنیزہ، شبینہ اور لیلیٰ کیوں نہ بن سکیں؟ تفصیل سے قطع نظر اس کا سیدھا جواب یہی ہے کہ حاتم محض جواد وفیاض ہونے کا افسانوی کردار ہی نہیں تھا، اس نے اپنے لیے اگر عام زندگی میں سیادت کے مرتبہ بلند سے فروتر کسی درجہ کا تصور نہیں کیا تو اس نے شاعری میں پامال راہوں پر چلنا گوارا نہیں کیا، امرؤالقیس کی شراب وشباب اور سرمستی و رعنائی کی شاعری سے پورا ماحول سرشار تھا اور اس کے دور کو ابھی کچھ عرصہ بھی نہیں گذرا تھا، اس کا انتقال ۵۳۹ء میں ہوا اور قریب یہی وہ زمانہ تھا جب حاتم طائی نے اس دنیا میں قدم رکھا، اس کے باوجود اگر اس کی شاعری اپنے عصر کے رنگ وآہنگ سے جدا ہے اور حمیت وشجاعت اور سخاو کرم کے عناصر سے لبریز ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے جاہلی شاعری کے بے سمتیوں کو ایک نئی جہت اور نیا رخ دینے کی شعوری کوشش کی، اس نے مہذب انسان کے حقیقی فرائض کو اپنی شاعری میں اس لیے سمویا کہ غیر تہذیب یافتہ معاشرہ اپنی پست سطح سے بلند ہونے کی کوشش کرے، ہم نے اس کی شاعری کا اگرچہ بغور مطالعہ نہیں تاہم جو کچھ نظر سے گزرا، اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ

تغزل اس کی شاعری میں بھی ہے لیکن محض وصل و فصل حبیب کی ساعت شماری کے لیے نہیں۔

الم تعلمی انی اذا الضیف نابنی   وعز القری اقری السدیف المسرهدا
اماوی انی لا اقول لسائل   اذا جاء یوما ، حل فی مالنا نزر
وقائلة : اهلکت فی الجود مالنا   و نفسک ، حتی ضر نفسک جودها
فقلت : دعینی ، انما تلک عادة   لکل کریم عادة یستعیدها
اماوی قد طال التجنب و الهجر   وقد عذرتنی فی طلابکم العذر
لا تعذلینی علی مال وصلت به   رحما و خیر سبیل المال ما وصلا
یفک به العانی ویو کل طیبا   وما ان تعریه القداح ولا الخمر
وانی لا ستحیی من الارض ان تری   بها الناب تمشی فی عشیاتها الخبر

ان اشعار میں تغزل کی اصطلاحی تعریف کے وجود سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن تسکین قلب ونظر سے قطع نظر یہ گفتگو صرف لب ورخسار اور دہن وکمر کی نزاکتوں اور حلاوتوں کے لیے خاص نہیں بلکہ شرافت اخلاق کی گفتگو ہے۔ اس کے دل میں بھی ایک آتش کدہ روشن ہے۔

اوقد فان اللیل لیل قرّ   والریح یا موقد ریح صرّ
عسی یری نارک من یمر   ان جلبت ضیفاً فانت حرّ
ولیس علی ناری حجاب یکنها   لمستوبص لیلا ولکن الیرها
تدل ضیفی علیّ فی غلس اللیل ، اذا النارُ نام موقدها

آتش ضیافت اس کے ہاں صرف واقعہ ہی نہیں ایک اعلیٰ مثال معاشرہ کی تصویر و تعبیر بھی ہے کہ جو آگ انسانیت کو نور و حرارت اور سوز و گداز اور راحت دے اس آگ کو کبھی سرد نہ ہونا چاہیے۔

حاتم طائی کے ذکر میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ اس کی سخاوت وفیاضی کی داستانیں عرب کے بچہ بچہ کی زبان پر تھیں، کہا جاتا ہے کہ وہ اس باب میں اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ اس کو جنون کے سوا اور کچھ کہا نہیں جاسکتا، ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ بچپن میں جب وہ اپنے دادا کے ساتھ رہتا تھا تو اپنا کھانا لے کر باہر نکل جاتا، اگر کوئی ساتھ کھانے والا مل جاتا تو اس کے ساتھ کھانا کھالیتا ورنہ کھانا پھینک کر آجاتا، اسی وجہ سے اس کے دادا اس سے نالاں ہوکر اس سے الگ بھی ہوگئے اور

اس کو صرف اونٹوں کی ذمہ داری اور نگرانی کے کام پر لگادیا، ایک دن عبید بن الابرص، بشر بن خازم اور نابغہ ذبیانی راستے میں اس کے پاس سے گزرے اور کچھ دیر کے لیے اس کے مہمان ہوے، حاتم ان میں سے کسی کو پہچانتا نہیں تھا، لیکن اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک اونٹ ذبح کردیا، آخر میں جب ان لوگوں نے اپنا نام بتایا اور تعارف کرایا تو اس نے اپنے تمام اونٹ جو تقریباً تین سو تھے ان میں بانٹ دیے اور پھر خوش ہوکر اپنے دادا کے پاس آکر کہا کہ میں نے لافانی عزت اور سرداری کا ہار آپ کے گلے میں ڈال دیا ہے، پھر پورا واقعہ سنایا، یہ حد سے گزرنا تھا، دادا کو اب اور تاب نہ رہی کہا بس اب سے تم میرے ساتھ نہیں رہوگے، حاتم نے کہا مجھے بھی اس کی پرواہ نہیں، پھر یہ شعر کہا:۔

وانی لعف الفقر مشترک الغنی   و تارک شکل لا یوافقه شکلی
واجعل مالی دون عرضی جنة   لنفسی واستغنی بما کان من فضلی
وما ضرنی ان سار سعد باهله   وافردنی فی الدار لیس معی اهلی

اسی طرح ابن الاعرابی نے لکھا کہ جب ماہ رجب کا چاند نظر آتا تو وہ ہر روز دس اونٹ ذبح کرتا اور لوگوں کو کھلاتا تھا اور لوگ بھی اس کے پاس آکر جمع ہوجاتے تھے۔

کہنا یہ ہے کہ ان داستانوں میں عجب عجب قصے ملتے ہیں ان کے متعلق یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ ان میں اکثر محض زیب داستان کے لیے گھڑ لیے گئے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے دین کے معاملہ میں امیہ، فخر وحماسہ میں عنترہ، زہد وورع میں ابوالعتاہیہ، بے باکی، بے حیائی اور مزاح میں ابونواس سے منسوب بہت سے اشعار ہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ سخاوت اور مہمان نوازی کے اوصاف عربوں کے اخلاق میں بہت نمایاں ہیں، عام طور سے کہا جاتا ہے کہ ایک غریب مفلس عرب جس کے پاس صرف ایک ہی اونٹنی ہوتی تھی اور اسی اونٹنی پر اس کے اہل وعیال کی گذر تھی، جب اس کے پاس کوئی مہمان آتا تو وہ بے پس وپیش اس اونٹنی کو نہایت خوشی سے ذبح کردیتا، اس طرح عرب عام طور پر اندھیری راتوں میں اپنے خیموں کے سامنے آگ جلایا کرتے تاکہ بھوکے پیاسے اور بھولے بھٹکے مسافران تک پہنچ جائیں، پھر وہ اس کی مہمانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے، امراور سا ایک سوال پر

اونٹوں کے گلے کے گلے بخش دیتے، اس ماحول میں حاتم طائی کی غیر معمولی سخاوت اگر ضرب المثل بنی تو تعجب کی بات نہیں اسی طرح اگر راویوں نے اس کی حکایات کے بیان میں مبالغہ یا وضع سے کام لیا تو یہ بھی زیادہ حیرت کی بات نہیں۔

مبالغہ و وضع کی مثال یہی روایت کی جاسکتی ہے کہ جب حاتم ماں کے پیٹ میں تھا تو ماں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اس سے پوچھ رہا ہے کہ تجھے ایک سخی لڑکا حاتم چاہیے یا دس بچے شجاع، مضبوط اور قوی چاہئیں، اس نے جواب دیا کہ میں سخی بچے کو ہی چاہوں گی، تین شاعروں کی مہمان نوازی کا واقعہ بھی بیان کیا گیا کچھ لوگوں نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ جب حاتم نے ان تینوں کے لیے تین اونٹ ذبح کر دیے تو ان مہمانوں نے کہا کہ ہمارے لیے تو ایک ہی اونٹ کافی تھا تو حاتم نے جواب دیا کہ صحیح ہے لیکن میں نے خیال کیا کہ تم تین آدمی ہو اور ایک ہی جگہ کے رہنے والے نہیں ہو جب تم اپنے اپنے وطن جاؤ گے تو آخر کچھ تو وہاں بیان کرو گے، اس پر ان تینوں نے حاتم کی شان میں چند اشعار کہے، جن کو سن کر حاتم نے کہا تمہاری یہ عزت افزائی، میری مہمان نوازی سے کہیں زیادہ بڑھ گئی اب تم ان تمام اونٹوں کو باہم تقسیم کر لو ورنہ میں ان کی کونچیں کاٹ ڈالوں گا، تینوں نے مجبور ہو کر وہ تمام اونٹ باہم تقسیم کر لیے۔ اس طرح ہر ایک کے حصے میں ۹۹۔۹۹ اونٹ آئے۔

ظاہر ہے اس قسم کے قصوں میں مبالغہ آمیزی کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اگر روایات میں مبالغہ ہے تو حاتم کے اشعار میں الحاقات و زیادات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ اگر اس کے قریب ۲۱۰ اشعار کے انتساب کو صحیح مانا گیا تو قریب ۵۲ اشعار ایسے بھی ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ حاتم سے منسوب ہیں لیکن دوسروں سے بھی ان کی نسبت ہے اور ۱۳۲ ایسے اشعار کی نشان دہی کی گئی جو اس سے منسوب ہیں لیکن وہ بالیقین اس کے نہیں، مثلاً

وآمرۃ بالبخل قلت لها اقصری — فذلک شئی ما الیہ سبیل

فانی رأیت البخل یزری باھلہ — فاکرمت نفسی ان یقال بخیل

اری الناس خلان الجواد ولا اری — بخیلاً لہ فی العالمین خلیلاً

یہ اشعار مختلف کتابوں میں اسحاق بن ابراہیم موصلی کے نام سے ہیں، لیکن ابن الشجری

نے غلط طریقے سے ان کو ابیات حاتم سمجھ لیا۔

اسی طرح یہ دو شعر:۔

ولم یحمدوا من عالم غیر عامل — خلاقاً ولا من عامل غیر عالم

واذا طرقات العجز عوجا قطیعۃ — واقطع عجز عندھم عجز حازم

یہ اشعار ابوتمام کے ہیں لیکن ایک نسخہ میں بغیر تحقیق کے ان کو حاتم سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر شوقی ضیف نے شعرائے صعالیک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ”قومی سیادت و فخر کی داستان طرازیوں میں کوئی شک نہیں کہ واقعات پر افسانوی رنگ غالب ہے اور حاتم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں“ ڈاکٹر نویہی نے اور زیادہ بلند آواز بلکہ حد انصاف سے قریب قریب متجاوز انداز میں لکھ دیا کہ ادب و تاریخ میں حاتم کے واقعات و اشعار کثرت سے مخترع اور ایجاد بندہ ہیں، جن کا مقصد قومی جذبات کو اساطیری اور دیومالائی رنگ دینا ہے، جیسے کہنے والوں کا یہ سمجھنا کہ حاتم کی قبر پر جو رکے گا وہ اس کی ضیافت کرے گا۔

واقعات اور اشعار کی غلط نسبت، غیر صحیح تعبیر اور ان کے پردہ میں قبائلی جوش، فخر کی داستانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن مطلق طور پر یہ کہنا کہ کثرت ایسے ہی اشعار کی ہے یہ بھی صحیح نہیں، یہیں نقادوں خصوصاً مستشرقین کی لے اس قدر بلند ہوتی ہے کہ باقاعدہ ادب میں مسئلہ انتحال، اپنے وجود کی اہمیت کو خاص طور پر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر نویہی نے اس باب میں اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ اس وضع و انتحال کا ایک بڑا سبب اقتصادی معاملہ ہے کیوں کہ جن بدوؤں نے حاتم کی زندگی میں اس کے کاموں کو اسراف کا نتیجہ سمجھا تھا، انہی اعمال کو اس کے بعد ایسے رنگ میں پیش کر دیا جس سے ان کی تنگی اور حسرت کا داغ ایک سنہری علامت میں بدل جائے، اس طرح انہوں نے اس کو اساطیری رنگ میں پیش کر کے اپنی ایک کمی کی تلافی کی، لیکن اگر یہ اعتراض دلیل ہے تو پھر تاریخ کے اکثر واقعات اس غرض و طرز سے بگاڑے اور بنائے جاسکتے ہیں، حقیقت وہی ہے جو بہت پہلے زبیر بن بکار نے کہی تھی کہ اسطورۃ ہونے کی دلیل پر ”لا تکاد النفس تصدق بھا“ دل ان کی تصدیق کرتا نظر نہیں آتا انہوں نے کہا کہ ”واحب امر حاتم حیلۃ من ورثتہ ونسبوہ الیہ“ ظاہر ہے یہ قرینہ

زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ عین انسانی فطرت کے مطابق ہے، زبیر بن بکار کو زمانی قربت حاصل ہے اس کی وجہ سے بھی اس قیاس کو رد کرنا مشکل ہے، اس سلسلہ میں ابوالعاص کے اس خط کا ذکر بھی نامناسب نہیں جو انھوں نے قبیلہ ثقیف کے ایک شخص کو لکھا تھا کہ:۔

ولم نر لامة ابغضت جوادا قط ولاحقرته، بل احبته واعظمته، بل احبت عقبه واعظمت من اجله رهطه، ولا وجدناهم ابغضوا لمجاوزته حد الجود الى السرف ولا حقرته، بل وجدناهم يتعلمون مناقبه و يدارسون محاسنه و حتى اضافوا اليه من نوادر الجميل مالم يفعله و نحلوه من غرائب الكرم مالم يبلغه۔

بہرحال اتنا مسلم ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اضافات والحاقات کیے گئے اور یہ ناقدین کی ذمہ داری ہے کہ اصل کو نقل سے امتیاز کریں اور اس کا واحد اور آسان طریقہ وہی ہے جو ارباب نقد اس قسم کے مسائل میں عمل میں لاتے آئے ہیں کہ شعر کے ظاہر و باطن کو دیکھ کر اور جانچ کر فیصلہ کریں کہ واقعی یہ شعر ایسا ہے جو حاتم جیسے شاعر سے سرزد ہو سکتا ہے، کیا اس شعر میں اس کی شخصیت کی جھلک ہے یا پھر یہ منطق و معقول کی حد سے باہر تو نہیں یا پھر وہ ایسے اقدار اور فضائل پر مشتمل ہے جو اس سماج اور معاشرہ کے لیے اجنبی ہیں اور اس لائق ہی نہیں کہ ان قدروں کا فروغ اس معاشرہ میں ممکن ہو، چنانچہ حاتم کے اشعار میں اگر واقعی اساطیری رنگ ہے جیسا کہ ابوالخیبری سے متعلق اشعار کہ حاتم قبر سے نکل کر مہمان نوازی کرنے لگا تو ظاہر ہے ان کی صحت پر کیسے اصرار ہوسکتا ہے۔

حاتم کے اشعار کے موضوع اور گھڑے ہونے کی دوسری قسم وہ اشعار ہیں جن میں خالص اسلامی روح سموئی ہوئی ہے، بت پرست ماحول میں خالص مومنانہ اشعار اگر کہے جاتے ہیں تو ان کا انتساب مشکوک ہو سکتا ہے، اس لحاظ سے بھی حاتم کے اشعار کو موضوع ثابت نہیں کیا جا سکتا، یہ صحیح ہے کہ حاتم کے ہاں وہی فضائل اور اخلاق جلوہ گر ہیں جن کی جانب اسلام توجہ دلاتا ہے، جود و عفت، وفا، صدق اور عدل وغیرہ، لیکن یہ انسانی خوبیاں کسی بھی مرد مستقیم سلیم الفطرۃ میں پائی جاسکتی ہیں کہ عقیدہ کے ماسوا ان کا اصل تعلق اعمال سے ہے، مروت کے اشعار

کثرت سے جاہلی شعراء میں ملتے ہیں تو کیا ان کو محض اس لیے رد کر دیا جائے گا کہ یہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں۔

البتہ بعض اشعار ایسے ہیں جن کے مضامین کا تعلق واقعی اسلام کے وجود سے خاص ہے، مثلاً:۔

یا رب عاذلة لامت فقلت لها   ان على الله مما ننفق الخلفا

فلو كان ما يعطى رياء لامسكت   به حبيات اللوم يجذبه جذبا

ولكنما يبغي به الله وحده   فاعط فقد اربحت في البيعة الكسبا

یا یہ شعر کہ

اما والذى لا يعلم الغيب غيره   ويحيي العظام البيض وهي رميم

ظاہر ہے قرآن کے مضامین سے اس قدر مماثلت، حاتم کے اشعار میں غرابت و تحیر پیدا کرتی ہے، اس لیے اس باب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ جہاں اسطوری اور اسلامی رنگ غالب ہے ان اشعار کو مخترعات و زیادات سے تعبیر کرنا غلط نہیں اور ایسے اشعار تعداد میں بہت کم ہیں۔

حاتم سے منسوب اشعار کی ایک اور قسم بھی ہے جن کو زیادات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے ان کے رد و اثبات کا معاملہ دشوار ہے کہ یہ اس سے منسوب مجموعہ شعر کے علاوہ دوسروں کے مجموعوں میں بھی شامل ہیں، لیکن اس تداخل کو وضع و اختراع بہرحال نہیں کہا جاسکتا، یہ رواۃ کی غفلت کہی جاسکتی ہے کہ ایک راوی نے ایک شعر کو عروہ کا سمجھا دوسرے نے حاتم کا اور کسی نے مسکین دارمی کا، بعضوں کو اتحاد مضامین کی وجہ سے شبہہ ہوا مثلاً اکرام ضیف، ایثار نفس و زاد اور پڑوسی کی حفاظت وغیرہ، **بعض شعراء مثلاً مسکین دارمی** نے شعر میں حاتم کی پیروی کی، چنانچہ امالی المرتضی میں یہ جملہ ہے کہ:۔

وكان مسكين كثير اللهج بالقول فى هذا المعنى، شاید اسی لیے خرائطی نے مسکین کے اس شعر کو حاتم سے منسوب کر دیا کہ:۔

ماضر جارا لى اجاوره   الا يكون لبابه ستر

یہ غلطی باعث تعجب بھی نہیں کیوں کہ خود حاتم کا مسلم الثبوت شعر موجود ہے کہ:۔

ماضر جارا يا ابنة القوم فاعلمى   يجاورنى الا يكون له ستر

اسی طرح ایک قصیدہ ہے کہ:

اعاذل ان یصبح صدای لقفرہ بعیدا نآنی صاحبی و قریبی

تری ان ما ابقیت لم اک ربہ و ان الذی افنیت کان نصیبی

اس کو حاتم سے منسوب کیا گیا حالانکہ یہ اشعار نمر بن تولب کے ہیں، لیکن اسی منسوب کنندہ نے ایک دوسرے مقام پر لکھا کہ نمر نے یہ اشعار حاتم کے ان اشعار سے متاثر ہوکر کہے کہ:

اماوی ان یصبح صدای لقفرۃ من الارض لا ماء لدی و لا خمر

تری ان ما اھلکت لم یک ضرنی وان یدی مما بخلت بہ صفر

ہر زبان کے شاعروں میں اس قسم کے توارد اور غلط انتساب کی مثالیں ملتی ہیں لیکن ان چند مثالوں کی بنیاد پر پوری عمارت کو غلط قرار دینا بھی نقد کے اصولوں سے انحراف ہے۔

بہر حال مسئلہ انتحال بڑا تفصیل طلب ہے، اس سلسلے میں سب سے اہم ابن سلام الجمحی کی کتاب طبقات فحول الشعراء ہے جس میں قدیم اشعار کی روایت کے سلسلے میں بصرہ اسکول کے علماء اور ناقدین کے نظریات کا ذکر ہے، ابن سلام نے بھی ان ہی باتوں پر زور دیا ہے جن کو ہم مختصرا اوپر لکھ چکے ہیں، اس کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ عربوں نے جب اشعار کی روایت اور مناقب اور جنگوں پر نگاہ کی تو بعض قبائل کو اپنے شعراء کے اشعار میں کمی کا احساس ہوا اور دیگر قبائل کے مقابلہ میں ان کی رزمیہ داستانیں مختصر محسوس ہوئیں تو انہوں نے اپنے مشہور شعراء کے اشعار میں اضافہ کر دیا، اس قسم کی مثالوں میں حسان بن ثابت کی شاعری ہے جس میں بعد میں اضافات کی کثرت ہوئی، متقدمین کے یہاں یہ مسئلہ اگر خالص ادبی اور تحقیقی تھا تو جدید دور میں مستشرقین نے اس بحث کو حسب عادت کچھ اور ہی رنگ دیا، نولدیکی اور دوسروں نے جاہلی شاعری کو عام طور سے مشکوک قرار دیا اور جن اشعار کو بہ مجبوری صحیح قرار دیا ان میں بھی الفاظ و تعبیرات کی وجہ سے شک پیدا کر دیا، لیکن دوسرے ممتاز ناقدین نے ان کے اعتراضات و شکوک کا جواب عمدہ طریقے سے دیا، مصطفی صادق الرافعی، ڈاکٹر ناصر الدین الاسد وغیرہ نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ان سب کا خلاصہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، خاص طور پر ڈاکٹر ناصر الدین الاسد نے مصادر الشعر الجاہلی میں مستشرقین اور ان کے سب سے بڑے عرب علم بردار طہ حسین کے ان

خیالات کا جواب بہت عمدہ دیا کہ اس انتساب غلط کی اصل وجہ عصبیت، دین، قصص، شعوبیہ اور الرواۃ ہیں، جن کے لیے ایک فریق کی حمایت اور دوسرے فریق کے مقابلہ میں ادب جاہلی میں اضافہ کیا گیا یا پھر نبوت کی صحت کے اثبات اور نبی کریم ﷺ کے خاندان اور نسبت قریش کے لیے ادب میں اضافے کیے گئے وغیرہ، ان اعتراضات پر ایک طوفان برپا ہو گیا، اس سلسلے میں ڈاکٹر الاسد نے اچھی بحث کی اور بتایا کہ جاہلیت سے منسوب شعری حصے کی تین قسمیں ہیں، ایک تو موضوع منحول، دوسرے صحیح اور تیسرے مختلف فیہ و مختلف علیہ، جس کے لیے ایسے علماء و محققین کی ہمیشہ بڑی جماعت رہی جن کی نگاہ تحوی بین دفتیھا الشعر الجاھلی الذی تیقنوا صحتہ بعد تحر واستقصاء وجمع وتمحیص ونقد جن کے سامنے جاہلی شاعری کا سارا خزانہ تھا اور جس کی صحت پر انہوں نے غور و استقصاء، جمع و تمحیص اور تنقید کے بعد یقین کا اظہار کیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مہمان نوازی کی بے مثال خوبی کے ساتھ حاتم کی شاعری میں خود نخ، عفت و پاک دامنی کے عناصر بھی پوری طرح جلوہ گر ہیں، بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب اپنے ماحول کے مزاج کے برخلاف ہیں، قبائلی حمیت و عصبیت، انتقام اور صنف لطیف سے علانیہ جسمانی خواہشات کے اظہار کے ماحول میں حاتم کی شاعری کی انفرادیت خود بخود مسلم ہوتی جاتی ہے۔

تحلم عن الادنین واستبق ودھم ولن تستطیع الحلم حتی تحلما

واغفر عوراء الکریم اصطناعہ واصفح عن شتم اللئیم تکرما

وکلمۃ حاسد من غیر جرم سمعت فقلت مری فانفذینی

وذی وجھین یلقانی طلیقا ولیس اذا تغیب یا تلینی

نظرت بعینہ فکففت عنہ محافظۃ علی حسبی و دینی

أأفضح جارتی واخون جاری معاذ اللہ افعل ما حییت

وما انا بالماشی الی بیت جارتی طروقا احییھا کآخر جانب

فاقسمت لا امشی علی سر جارتی ید الدھر ما دام الحمام یغرد

حاتم کی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں نے ان کی شاعری میں صداقت، مہر و وفا، تواضع،

مصالحت، خودداری اور شرافت نفس جیسی اعلیٰ انسانی صفات و اخلاق کی نشان دہی کی ہے، عموماً ایسی شاعری کو ظاہر ہیں شاعرانہ کیف و حظ سے عاری تصور کرتے ہیں لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو حاتم کی شاعری محاسن شعر کے مروجہ اصولوں پر بھی پوری اترتی ہے۔

شاید اسی لیے دنیا کے سب سے بڑے ادیب و سخن شناس کے سامنے جب حاتم کی بیٹی سفانہ قید ہوکر آئی اور یوں گویا ہوئی کہ:۔

"یا محمد ان رأیت ان تخلی عنی ولا تشمت بی احیاء العرب فانی ابنة سید قومی، وان ابی کان یحمی الذمار و یفک العانی و یشبع الجائع و یکسو العاری و یقری الضیف و یطعم الطعام ولیفشی السلام ولم یرد طالب حاجة قط، وانا ابنة حاتم طی، فقال النبی ﷺ یا جاریه، هذه صفة المومنین حقا، لو کان ابوک مومنا لترحمنا علیه، خلوا عنها فان اباها کان یحب مکارم الاخلاق، والله تعالی یحب مکارم الاخلاق"۔

اے محمد ﷺ آپ مجھے رہا کردیں اور عربوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیں کیوں کہ میں اپنے قوم کے سردار کی بیٹی ہوں، میرے والد قابل نگہداشت چیز کی حمایت و حفاظت کرتے تھے وہ اپنے لوگوں کو رہائی دلاتے تھے، بھوکے کو سیر اور بے لباس کو لباس دیتے، مہمان نوازی کرتے، کھانا کھلاتے اور سلام کو عام کرتے تھے، انہوں نے کبھی کسی ضرورت کو رد نہیں کیا، میں حاتم طی کی بیٹی ہوں، یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، اے خاتون، درحقیقت یہ خوبیاں مومنوں کی ہیں، اگر تمہارے والد مومن ہوتے تو ہم ان سے رحم کا معاملہ فرماتے، اس خاتون کو چھوڑ دو، کیوں کہ اس کے والد مکارم اخلاق کو پسند کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی پاکیزگی اخلاق کو پسند کرتا ہے۔

ابوطالب لندنی اور ان کا رسالۂ موسیقی

پروفیسر انوار احمد☆

ابوطالب خاں اصفہانی انگلستان اور یورپی ممالک کی سیر و سیاحت کے سبب ابوطالب لندنی کے نام سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں، ان کے والد حاجی محمد بیگ خان آذربائیجانی ترک تھے لیکن ان کی پیدائش اصفہان میں ہوئی تھی، زمانۂ شباب میں ہی تلاش معاش کے لیے وہ ہندوستان چلے آئے اور نواب ابوالمنصور خان صفدر جنگ کی ملازمت اختیار کرلی، محمد قلی خاں نائب صوبہ دار اودھ کی نصرت و مساعدت سے خان موصوف نے عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزاری لیکن ان کی وفات کے بعد خان موصوف کی قدر و منزلت میں کمی ہونے لگی اور معاشی حالت زار و زبون ہوگئی، بددل ہوکر چند وفادار ملازموں کے ساتھ بنگال کے سفر پر روانہ ہوئے، ایک مدت تک اس علاقے میں عافیت و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی، آخر ۱۱۸۲ھ میں پینسٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر مرشدآباد میں وفات پائی۔

ابوطالب لندنی کی پیدائش ۱۱۶۶ھ میں لکھنؤ میں ہوئی، خود اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

''......(۱) ولادت ایں بی سعادت در ۱۱۶۶ھ در شہر لکھنؤ اتفاق افتادہ، بعد قضیہ مذکور نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم بہ مقتضای اتحاد ایلی در صدد تربیت بر آمدہ، بہ جہت ایں کمترین مدد خرج مکتب و معلم تعیین نمود......''

نواب شجاع الدولہ میرزا ابوطالب کے بچپن میں جب ان کے والد بنگال میں تھے ان کی سرپرستی کرتے رہے اور ان کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہوئے، نواب موصوف فیض آباد سے جب بھی

---

(۱) خلاصۃ الافکار مخطوطہ خدابخش

☆ سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی مسکن کوٹھی، باقر گنج گولہ روڈ، پٹنہ - 4

لکھنؤ تشریف لاتے، ابوطالب کی احوال پرسی ضرور کرتے، اپنے والد کے مرشد آباد چلے جانے کے کچھ برسوں بعد میرزا ابوطالب بھی اپنی ماں کے ساتھ وہاں چلے گئے، کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے والد وہاں ۱۱۸۲ھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے، اس وقت ابوطالب کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

والد کی وفات کے بعد امور خانگی کی ذمہ داری ان کے سر آئی، لیکن نواب مظفر جنگ کے لطف و کرم کی بناپر چھ سال تک ان کے دربار سے وابستہ رہ کر وظائف خانوادگی کا ایفا بہ طریقۂ احسن کرتے رہے، ۱۱۸۹ھ میں نواب آصف الدولہ (۱) کے اوائل جلوس کے زمانے میں ابوطالب لکھنؤ واپس آگئے اور دولت اودھ کی ملازمت اختیار کرلی، یہاں مرتضیٰ علی خاں (۲) مختار الدولہ نائب آصف الدولہ جن سے ان کے دوستانہ روابط تھے کی تجویز پہ دوآبہ کے کچھ علاقوں کی نظامت اور فوج کے ایک رسالے کی زمام داری سید زین العابدین (۳) کی مشارکت میں ان کو سونپی گئی، میرزا ابوطالب ہمیشہ سید موصوف کی رفاقت میں حکومت کے امور خطیر کو انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ سید موصوف منیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے خلاف شورش و فتنہ بپا کرنے کی آفت میں مبتلا تھے، اس وقت بھی ابوطالب سید موصوف سے کنارہ کش نہیں ہوئے لیکن اس واقعہ سے سید مرحوم نواب آصف الدولہ کی نگاہ میں نامعتبر ہوچکے تھے اور اس دوستانہ رشتے کو وہ ناپسندیدہ سمجھتے تھے، اس واقعہ کے علاوہ کچھ اور بے بنیاد اسباب کی بناپہ میرزا ابوطالب اور نواب اودھ کے مابین سوئے تفاہم ہوگیا، جس کے نتیجے میں نواب میرزا موصوف سے رنجیدہ خاطر ہوگئے، سید زین العابدین کی وفات کے بعد میرزا اقتدار سے الگ کردیے گئے اور انھیں کرنل ہانی کی مصاحبت میں کام کرنے پر مجبور کیا گیا، جو اس وقت نواب کی جانب سے گورکھپور کے خطے کے انتظامات کے لیے منصوب ہوا تھا، کرنل ہانی ایک بدطینت انگریز افسر تھا، کسی طرح تین سال کی مدت میرزا ابوطالب نے اس کی معیت میں کام کرتے ہوئے گزاردی، لیکن اس کے بعد کرنل مذکور میرزا کے درپے آزار ہوگیا۔

لیکن مسٹر جانسن بہادر نے جو سرکار اودھ کے انتظامات میں معاونت کے لیے ایسٹ انڈیا

(۱) متوفی ۱۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ (۲) بسنت علی خان خواجہ سرا کے ہاتھوں ۱۱۹۰ھ میں شہید ہوئے (۳) متوفی ۱۱۹۲ھ

کمپنی کی جانب سے مقرر ہوا تھا، میرزا ابوطالب کی حمایت کی اور کرنل ہانی کے شر سے انھیں محفوظ رکھا، لیکن سکون و اطمینان کا زمانہ تادیر قائم نہ رہ سکا، میرزا پھر کرنل کی معاندانہ حرکات کے مورد بنے، کرنل کی ایذا رسانی سے میرزا کی طبیعت اس درجہ منزجر اور متنفر ہوگئی کہ انھیں ۱۲۰۲ھ کے اواسط میں کلکتہ کے لیے عازم سفر ہونا پڑا، کلکتے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عاملین میرزا ابوطالب کے ساتھ خوش رفتاری سے پیش آئے اور ان کی نصرت و حمایت سے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

پھر ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۹ء، اوائل رمضان میں میرزا ابوطالب سروان رچارڈسن کی رفاقت میں سفر انگلستان کے لیے روانہ ہوئے، انگلستان اور یورپی ملکوں میں پانچ سال تک مقیم رہ کر ۵؍ ربیع الاول ۱۲۱۸ھ کو کلکتہ لوٹ آئے، میرزا نے اپنی مسافرت کے واقعات اپنے سفرنامہ موسوم بہ ''مسیر طالبی فی بلاد افرنجی'' میں مشروحاً بیان کیا ہے، ابوطالب اصفہانی کی وفات لکھنؤ میں ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں ہوئی، میرزا کی تاریخ وفات کا ثبوت دو قطعات منظوم کردہ طامس ولیم بیل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جو ان کی کتاب ''مفتاح التواریخ'' میں شامل ہیں، ان میں سے ایک قطعہ بقراء ذیل ہے:۔

رختِ سفر چو بست ابوطالب از جہاں ‍ ‍ ‍ ‍ ہوش و حواس عالمیاں از دماغ رفت
ہاتف ز غیب بادل افگار ناگہاں ‍ ‍ ‍ ‍ از بہر سال فوت دوصد بار آہ گفت

اس قطعۂ تاریخ میں طریقِ تعمیہ کو بروئے کار لایا گیا ہے، دل افگار 'گ' یعنی 'ک' ہے جس کا عدد ۲۰ ہے اور آہ کے عدد ۶ کو ۲۰۰ سے ضرب دینے سے ۱۲۰۰ کا عدد مرتب ہوتا ہے، ۱۲۰۰ اور ۲۰ کا حاصل جمع ۱۲۲۰ ہوتا ہے، یہی سنہ ہجری ابوطالب کی تاریخ وفات ہے اور دوسرا قطعہ اس طرح منظوم ہوا ہے:۔

برفت چوں ز جہاں میرزا ابوطالب ‍ ‍ ‍ ‍ دو دیدہ در غم والمش بجز اشک نشست
بگفت ہاتف غیبی ز بہر تاریخش ‍ ‍ ‍ ‍ کہ بود سال وفاتش ہزار و دو صد و بست = ۱۲۲۰ھ

یہ دونوں قطعات طامس ولیم بیل نے میرزا یوسف باقر (۱) پسر میرزا ابوطالب کی درخواست پہ منظوم کئے تھے، میرزا باقر نے بقول ولیم بیل ۱۸۲۷ء میں مسیحی مذہب قبول کرلیا تھا۔

(۱) مفتاح التواریخ، مطبوعہ نول کشور

ابوطالب لندنی کی ادبی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں، ان کی تصنیفات میں تذکرہ نویسی، تاریخ نویسی، موسیقی شناسی، سیاحت نگاری اور اخلاقیات شامل ہیں، ادب کی ان صنفوں میں شایان توجہ خدمات کے باوصف ابوطالب ایک باہنر شاعر بھی تھے، ان کے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ کتاب خانہ باڈلین میں موجود ہے، ان کے ادبی مآثر جو دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں وہ بشرح ذیل ہیں:-

تذکرہ خلاصۃ الافکار: اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں مرتب کیا گیا، یہ فارسی تذکرہ اپنے بعض مشتملات کی بنا پر حائز اہمیت ہے، اس کی تالیف کا آغاز ۱۲۰۶ ہجری ہے اور سال اتمام ۱۲۰۷ ہجری ہے، جیسا کہ تذکرے کے مقدمے میں مصنف نے ذکر کیا ہے، مصنف نے آغاز و انجام تالیف کو سترہ قطعوں میں بیان کیا ہے، ایک قطعہ کے تاریخی مادّے جن سے آغاز و انجام کی تاریخیں مستخرج ہوتی ہیں وہ اس طرح ہیں: ''جمع یکجا خلاصۃ الافکار'' = ۱۲۰۶ھ اور گل بی خار و گنج بی رنج = ۱۲۰۷ھ۔

یہ تذکرہ ایک مقدمہ، اٹھائیس حدیقہ ایک ذیل اور ایک خاتمہ پر محتوی ہے، حدیقہ کے شعبے میں تین سو نو شاعروں کے احوال و اشعار ہیں، ''ذیل'' کے فصل میں ایک سو انسٹھ شاعروں کے نمونہ ہای کلام ہیں اور خاتمہ کے باب میں تیئیس معاصر شعرا کے واقعات زندگی کی مختصر اطلاعات اور منتخب اشعار ہیں، اس طرح تمام شعراء کی تعداد بشمول مصنف ۴۹۲ تک پہنچتی ہے۔

مصنف نے اس تذکرے کی تالیف میں ''ریاض الشعرا'' مولفہ علی قلی خان والہ داغستانی اور آزاد بلگرامی کے تذکرے ''سرو آزاد'' اور ''ماثر الکرام'' سے استفادہ کیا ہے، اس تذکرے میں مقدمہ اور خاتمہ کے باب زیادہ مفید اور لایق توجہ ہیں، مقدمہ میں مصنف نے فارسی شاعری کی ابتدا اور تحول و تکامل سے بحث کی ہے اور تذکرہ نویسی کے فن کے مستلزمات کا بھی ذکر کیا ہے، جبکہ خاتمہ کا باب ان معاصر شاعروں کے احوال پر مشتمل ہے جن سے یا تو وہ مراودت و معاشرت رکھتے تھے یا مکاتبہ و مراسلہ کے ذریعہ رابطہ رکھتے تھے، یہ تذکرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اس کے قلمی نسخے کتاب خانہ خدابخش پٹنہ کے علاوہ، کتاب خانہ ملک تہران، کتابہ خانہ دانش گاہ پنجاب (لاہور)، باڈلین لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں، کتاب خانہ خدابخش کا

نسخہ شمارہ ۷۱۲، فارسی نمبر ۲۱۹، ۲۵۷ اوراق پر مشتمل ہے، اس نسخے کی کتابت کی کوئی تاریخ نہیں دی گئی ہے لیکن قیاساً انیسویں صدی عیسوی کی تحریر معلوم ہوتی ہے، مصنف کے پانچ رسالوں میں صرف دو ہی رسالے رسالہ در علم اخلاق اور رسالہ در مقدمات موسیقی، اس نسخے میں شامل ہیں، بقیہ تین رسالے ''علم عروض و قافیہ'' رسالہ ''فنون خمسۂ طب'' اور ''لب السیر و جہان نما'' اس نسخے میں موجود نہیں ہیں۔

میرزا ابوطالب کی دوسری اہم تصنیف جس کی وجہ سے وہ انگلستان اور دوسرے یورپی ملکوں میں معروف ہیں ''مسیر طالبی فی بلاد افرنجی'' ہے، اس کے قلمی نسخے کتاب خانہ خدابخش، موزۂ برطانیہ، کتاب خانہ باڈلین، ذخیرہ سبحان اللہ علی گڑھ اور آصفیہ لائبریری میں دستیاب ہیں، یہ مصنف کی یورپی سیاحت کی نہایت جالب و جمیل داستان ہے، جس کے تراجم انگریزی اور اردو زبانوں میں ہو چکے ہیں، ابوطالب کی ایک منظوم تصنیف علم ہیئت کے موضوع پر بعنوان ''معراج التوحید'' بھی ہے، اس کا نسخہ کتاب خانہ ادنبرگ میں موجود ہے، اسی کتاب خانے میں مصنف کی ایک مثنوی موسوم بہ ''سرور افزا'' بھی ہے اور ان کے فارسی دیوان کا قلمی نسخہ کتاب خانہ باڈلین میں محفوظ ہے۔

میرزا ابوطالب کا تیسرا رسالہ موسیقی پر ہے، ذیل میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:-

رسالہ در مقدمات موسیقی

حمد و ستایش کے لیے دنیاؤں کے خداوند کی ذات یکتا شائستہ و سزاوار ہے اور پیغمبر محمد ﷺ اور ان کی اولاد و اصحاب پہ درود و سلام واجب ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ موسیقی ایک سریانی (۱) لفظ ہے، سریانی زبان کی اصطلاح میں موہوا کو کہتے ہیں اور سیقی کا مفہوم گرہ ہوتا ہے، یعنی اس فن کا عالم ہواؤں میں گرہیں لگاتا ہے، معتبر دانشوروں کی اکثریت اس خیال پر متفق ہے کہ تخلیق کائنات کے آغاز میں روحِ لطیف کو جسم کثیف کی صحبت سے وحشت تھی یہاں تک کہ فرح بخش و جان پرور آہنگ غیب کے پردے سے نکل کر اس کے کانوں میں پہنچی، روح نے تجانس ذات کی بنا پر اس صدا کی پذیرائی کی اور اسے اپنے وجود میں سما لیا، اس کے بعد ہی بدن کی صحبت و قربت پر آمادہ

(۱) یہ عربستان کی آرامی قوم کی زبان ہے جو ۱۵۰۰ تا ۱۳۰۰ ق م بابل اور بین النہرین میں زندگی گزارتی تھی، سریانی عبرانی فنیقی اور عربی سے مشابہ ہے۔

ہوئی ، اس طرح روح کا رشتہ مرغوب ومترنم صداے اس کے رشتۂ بدن کی نسبت مقدم ہے ،
حدیث میں آیا ہے ''السماع (۱) معراج الاولیاء مخصوص علی انفسهم '' ۔

شیخ نظام الدین دہلوی ، ان کا مرقد مبارک پاکیزہ رہے ، فرماتے تھے کہ ہمیں عہد و پیمان
کے روز اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں) کا آہنگ پوربی لے میں سامعہ نواز ہوا اور وہ کیفیت
اب بھی اس طرح مشاہدے میں ہے کہ جیسے یہ کل ہی کا واقعہ ہو بلکہ اس روز کی شب ہنوز نہیں آئی ،
شیخ جنید (۲) سے کسی نے سوال کیا کہ کوئی شخص سکون و آرام کی حالت میں ہوتے ہوئے اچانک
کوئی نغمہ سنتا ہے تو ہیجان واضطراب کی کیفیت اس کے دل میں کیوں پیدا ہوتی ہے ، کہا کہ خداے
بزرگ و برتر نے روز ازل آدم کی اولاد سے خطاب بہ کلمۂ ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' نہایت خوش لحن
آواز میں کیا تھا ، اس کلام کی شیرینی ان کی روحوں کے کانوں میں آج بھی رس گھول رہی ہے ، لہذا
جب کوئی انسان صداے خوش گوار سنتا ہے تو کیف ونشاط سے مغلوب ہو کر جھومنے لگتا ہے ۔

آواز کے بیان میں : نغمہ کو ہندی زبان میں ناد کہتے ہیں ، معلوم ہونا چاہیے کہ نغمہ کی دو قسمیں
ہیں ، پہلی قسم جو ممکن و میسر اشیا کے توسط کے بغیر ہو ، اسے ہندوستانی سنگیت کے گیانیوں کی اصطلاح
میں اناحید کہتے ہیں ، یہ وہ سُر ہے جس کا وجود روز ازل سے ہے اور اب بھی جس طرح پہلے تھا اسی
حال میں موجود ہے اور اکثر علما کا نظریہ یہ ہے کہ خداے لاشریک کی علامت وہی صداے لازوال
ہے ، ہندو اور مسلم صوفیوں نے اس صدا کو برتر و برگزیدہ اذکار میں شمار کیا ہے اور اسے کڑی
ریاضتوں سے حاصل کرتے ہیں اور جب مرتبۂ کمال کو پہنچتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں ، پھر
سامعہ کی خصوصیت باقی نہیں رہتی ، مسلمان اور ہندو درویشوں کے مابین فرق صرف اس قدر ہے
کہ اہل اسلام اس آواز میں اسم اللہ کا تصور کرتے ہیں اور اسے اذکار کا سلطان موسوم کرتے ہیں ،
جب کہ ہندو اس سے شوہنگ شبد کا استنباط کرتے ہیں اور نشاط و مسرت کے بازار میں جوش و جنبش
اور حدت و حرارت پیدا کرتے ہیں ۔

---

(۱) سماع اولیاء کے درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے جو انہیں حضرات کے ساتھ مخصوص ہے ، اس جملے کا
حدیث سے تعلق میرے خیال میں مستبعد ہے ، یہ کسی صوفی کا قول ہو سکتا ہے (۲) ابوالقاسم بن محمد بن جنید ،
عارف معروف بغداد ، متوفی ۲۹۷ھ

صدا کی دوسری قسم وہ ہے جو اشیاے ممکنہ کے وسیلے سے خارج ہوتی ہے ، صدا کی اس نوعیت کو اہل ہند
آہد کہتے ہیں اور یہ کیفیت ہوا پر قائم ہے ، جو چہار عناصر میں سے ایک ہے ۔

حکما نے کہا ہے کہ جب دو سخت و سنگین چیزیں شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوتی
ہیں تو اس صورت کو قلع کہتے ہیں یا سختی و صلابت سے ایک دوسرے سے متوصل ہوتی ہیں تو اسے قرع
کہتے ہیں ، اس صورت میں ہواؤں میں تموج پیدا ہوتا ہے ، جس طرح پانی میں سخت چیز پھینکنے سے
لہریں پیدا ہوتی ہیں اور وہ تموج پُر کیف وجد و سرور کا موجب بنتا ہے ، اسے صوت یا آواز کہتے ہیں ،
لوہا ، لکڑی ، پتھر ، آسمانی برق کی موجیں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو اس سے آہنگ کا صدور ہوتا ہے ،
انسان اور حیوان کی صداؤں میں بڑا تفاوت ہے ، ہوا جو انسان کے منہ اور ناک کے سوراخوں کے
ذریعہ بدن میں داخل ہوتی ہے ، اسے وہ پھیپھڑے کی قوت سے باہر نکالتا ہے ، کیوں کہ سینے کے اندر
کی تنگی کے سبب ہوا باہر نکلنا چاہتی ہے ، اس طرح ہونٹ ، زبان و رتالوکی حرکتوں کی بنا پر حروف و
کلمات مختلف صورتوں میں زیر و بم اور ناک سے نکلنے والی اصوات لفظوں کے اختلاف کے ساتھ ظاہر
ہوتے ہیں ، لیکن آواز کی طہارت و کدورت مزاجوں کے تغیر پر منحصر ہے ، انسان کے حلق میں بلغم کی
تولید ہمیشہ ہوتی رہتی ہے اگر یہ تحلیل نہ ہو تو بشر کی آواز کریہہ و کثیف ہو جاتی ہے ، یہی سبب ہے کہ معمر
آدمیوں کی آوازیں اکثر مکدر ہوتی ہیں ، کیوں کہ پیرانہ سری میں انسان کی طبعی قوت مائل بہ تنزل
ہو جاتی ہے ، وہ طبیعت کے فاسد مواد کی تحلیل پر حسب ضرورت قادر نہیں رہ پاتا ۔

القصہ جب موسیقی کی لذت سے خواص و عوام کی جماعتیں آشنا ہوئیں تو اس کے زیر و بم
کی گوناگوں صداؤں سے اپنی پسند کی مناسبت سے انہوں نے عشرت و طرب کی بساطیں سجالیں ۔

لیکن آج جو موسیقی دانش مندوں کے درمیان معتبر و مشہور ہے اس کی دو قسمیں ہیں ، نوع
اول میں وہ نغمہ آتا ہے جس کا تعلق ایران و توران سے ہے اور نوع دوم ہندوستانی نغمہ ہے ۔

نغماتِ قریش کا ذکر : امام فخر الدین رازی (۱) کے قول کے مطابق اس کا آغاز حکیم

---

(۱) امام المشککین فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) علم کلام و معقولات میں سرآمد عصر تھے ، عہد خوارزم شاہی کے
معروف فلسفی جن کے ادبی آثار میں ''تفسیر مفاتیح الغیب'' ، ''نہایۃ العقول'' ، ''کتاب الاربعین'' ، ''محصل
افکار المتقدمین والمتاخرین'' وغیرہ شامل ہیں ۔

فیثا غورث (۱) تلمیذ پیغمبر سلیمانؑ سے ہوا ہے، حکیم مذکور کی بابت یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شب اس نے ایک خواب دیکھا کہ ایک شخص اس سے کہہ رہا ہے کہ کل ساحلِ دریا پہ جاؤ وہاں تم پر ایک علم کا انکشاف ہوگا، حکیم موصوف نے ویسا ہی کیا، ساحل دریا پر وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں چند آہنگر لوہے کے ٹکڑوں کو بھٹی سے نکال کر ہتھوڑے سے پیٹ رہے تھے، اس جگہ فیثا غورث مراقبہ میں منہمک ہوگیا اور ہتھوڑے کی صدائے زیروبم سے وہ موسیقی کی دھنیں اخذ کرتا رہا، پھر موعظت و حکمت پر مشتمل اس نے ایک قصیدہ مرتب کیا اور بنی اسرائیل کی محفل میں آکر اس نے اس شعری کاوش کو نہایت خوش نوا انداز میں سنایا، شائقین کی ایک کثیر جماعت حکیم موصوف کے مرغوب و ملائم نغمات سے مسحور ہوکر از خود رفتہ ہوگئی اور وفور رغبت کا اظہار اس طرب انگیز آہنگ سے کرنے لگی، اس کے بعد دوسرے دانش مندوں نے غور و تعمق کی نگاہ سے استفادہ کرکے اس حقیقت کا پتہ لگایا کہ دنیا کو منور کرنے والا آفتاب ہر بُرج میں ہنگامِ تحویل ایک جداگانہ صدا کے خروج کا موجب ہوتا ہے، جس کی بنا پر انہوں نے بارہ بُرجوں سے موسیقی کے بارہ مقامات کے علم کا اکتساب کیا اور یہ درج ذیل دو بیت موسیقی کے بارہ مقامات کے اسما پہ مشتمل ہیں:۔

راست[1] ، عشاق[2] ، بوسلیک[3] ، بساز بانوا[4] ، اصفہان[5] ، بزرگ[6] نواز
زیرِ افگن عراق[8] و زنگولہ[9] پس حسینی[10] و راهوی[11] و حجاز[12]

اور اس کی شاخیں شب روز کے ساعات کی مناسبت سے چوبیس تک پہنچتی ہیں اور نغموں کی تعداد سال کے ایام کے مطابق تین سو ساٹھ مقرر کی گئی ہیں۔

بعض علما کا یہ خیال ہے کہ فیثا غورث نے موسیقی کے اصول کو افلاک کی صداؤں سے دریافت کیا ہے اور کہا ہے کہ افلاک کی آواز سے خوشتر کوئی نغمہ نہیں اور علم موسیقی میں یہ امر مسلمات میں شمار کیا جاتا ہے کہ توافق و توازن کی نسبت سے زیادہ نفیس و مہذب کوئی نسبت نہیں۔

اگر کسی وجہ سے صوتیات کے نظم و ضبط میں ہم آہنگی نہ ہو اور وہ حد اعتدال سے باہر ہو تو لازماً ایسی آواز وحشت و بیزاری کا موجب ہوگی اور صاحبان بصیرت اور علم موسیقی کے ماہرین اس

---

(۱) یونانی فلسفی اور ریاضی داں (م ۴۹۷ ق م) شاہان ہخامنشی کوروش کبیر اور دار یوش کا ہم عصر تھا، مصر، ایران اور ہندوستان کا سفر کیا تھا۔

حقیقت سے واقف ہیں کہ روح کا رشتہ جسم کے ساتھ اعتدال کی شریف و نفیس نسبت پر مبنی ہے اور یہی نسبت عناصر کے اجزاء کے درمیان موجود ہے، عاشق کی حقیقت کی بنا بھی یہی [illegible]ت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نسبتِ شریفہ کا جہاں بھی وجود ہے، روح کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور اس کو حال و وجد میں لانے کا موجب بنتی ہے، جس طرح حسن و جمال کا انحصار اعضا و جوارح کی مخصوص مناسبت پر ہے اور فصاحت و بلاغت عبارت ہے کلام کے اجزاء کے مابین مخصوص تناسب و ارتباط اور موقع و محل کی شائستگی سے، اسی طرح نغمات کی تاثیر بھی صوتی اعتدال پر مبنی ہے، مسعود بیگ نے اپنی بعض تصنیفات میں ذکر کیا ہے کہ نغمات بھی مختلف مزاجوں کے حامل ہوتے ہیں، گرمی، سردی یا کسی اور کیفیت میں یہ انسان کے طبایع کے مانند ہوتے ہیں، لہٰذا حتمی طور پہ تمام نغمات صرف ایک صوتی کیفیت میں مرغوب و مطبوع نہیں ہوسکتے، نہ سننے والوں کے لیے اور نہ گانے والوں کے لیے۔

ہندوستانی نغموں کے بیان میں: ہندی نغمات کی ابتدا و ایجاد کی بابت بہت زیادہ اختلافات ہیں، یہاں تک کہ روز ازل سے اس کی موجودگی یا اتفاقاً بعد کو اس کے وقوع پذیر ہونے کے مسئلے میں بھی اختلافات ہیں، اس فن کے بعض علما اس کی اصل کو ناحد پر منشعب کرکے اسے ازلی و ابدی تصور کرتے ہیں اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا قول جیسا کہ قبل ذکر ہو چکا، اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے، جب کہ دانش وروں کا ایک دوسرا فرقہ اس کو حادث تصور کرتا ہے اور آحد سمجھتا ہے جو ممکنات کے وسیلے سے صورت پذیر ہوتا ہے، اس طبقے کے اندر مزید اختلافات ہیں، ایک گروہ اسے کرشن جی سے منسوب کرتا ہے، لیکن دکن کے اکثر نایکان جس امر پر متفق ہیں وہ یہ ہے کہ مہادیو کے اختیار میں چھ دیو اور تیس پریاں تھیں، یہ پریاں ہر دیو کے حصے میں پانچ پانچ کی تعداد میں منقسم تھیں، یہ دیو و پری مہادیو کے پرستار اور اس کے دربار کے مقربوں میں تھے، ان میں سے ہر ایک دن رات کے اوقات کے درمیان کسی مخصوص ساعت میں ایک مخصوص آہنگ میں نغمہ سرا ہوکر اس کی پرستش کرتے تھے، راگوں اور راگنیوں کے نام ان کے ناموں پر مقرر کیے گئے، چند راگ، اور راگنی کی آمیزش سے چھ راگنیاں بنائی گئیں، پھر ان کی شاخیں وجود میں آئیں، ان کو بھار جا کہتے ہیں، ان کی تعداد احاطۂ حساب و شمار سے باہر ہے، ان کی مثال حروف مفردہ جیسی ہے

جو مختلف الفاظ سے مرتب ہو کر تکلم کا وسیلہ بنتے ہیں، یہ آمیزش انسانی تصرفات کا نتیجہ ہے، بھارجا کی تعداد دکن کے موسیقی شناسوں کے قول کے بموجب اُنچاس ہزار ہے اور چھ راگوں کے نام اس طرح ہیں: اول بھیرون، دوم مالکوس، سوم ھندول، چہارم دیپک، پنجم سری راگ، ششم میگھ راگ اور راگنیوں کے نام کی بابت کئی طرح کی روایتیں ہیں، جن میں سے ایک فرقے کی روایت کا انتخاب کر کے لکھا جاتا ہے۔

راگنی ھای بھیرون: اول بھیروی، دوم ماسری، سوم نٹ، چہارم پٹ، پنجم للت اور مالکوس کی راگنیوں کے نام یہ ہیں: اول کورا، دوم کنباوتی، سوم مارو، چہارم رام کلی، پنجم گن کلی اور ھندول کی راگنیوں کے نام بقرار ذیل ہیں:۔

اول بلاول، دوم ٹوڈی، سوم دیوساکھ، چہارم کندھار، پنجم مدھ ماوتھ اور دیپک کی راگنیوں کے اسماء اس طور ہیں: اول دھناسری، دوم کلیان، سوم پوربی، چہارم کدارا، پنجم دیسی اور میگھ راگ کی راگنیوں کے نام اس طرح ہیں: اول سدھ ملار، دوم کامودی، سوم بنگال، چہارم کوندو، پنجم کمود اور سری راگ کی راگنیوں کے نام حسب ذیل ہیں: اول کوری، دوم ککب، سوم پنجم، چہارم کوجری، پنجم اساوری اور ہر راگ و راگنی کو ساٹھ اولاد ہیں، لیکن یہ بھارجا کی قسمیں ہیں، اس لیے ان کے ناموں کا ذکر کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

اور اس طبقے کے خیال کے مطابق سُر کی تعداد سات ہے جسے سپت سُر کہتے ہیں اور یہ حسب ذیل ہیں، اول کھرج، دوم رکھب، سوم کندھار، چہارم مدھم، پنجم پنچم، ششم دھیوت، ہفتم نکھاد، موسیقی دانوں کا خیال ہے کہ نوع بشر میں کوئی بھی تین سُر سے زیادہ واقف نہیں اور بقیہ چار دیووں کے لیے مختص ہیں اور ان سات سُروں میں مقامات ہوتے ہیں جن کو اکرلم کہتے ہیں۔

دیووں سے انسانوں کی جانب یہ راگ کس طرح منتقل ہوئے، اس کی بابت دو روایت ہیں، عالموں کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ عہد عتیق میں دیو اور انسان ایک [illegible] کے روبرو ہوتے تھے، دکن کے نائکوں نے دیووں سے صحبت و اختلاط کے اوقات میں اس علم کو ان سے سیکھا، جب کہ دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ دیو ہمیشہ انسانوں [illegible] مستور رہتے تھے لیکن دکن کے نائک

جادو اور سحر سازی کے طریقوں کو اپنا کر انہیں اپنے سامنے نمودار ہونے پر مجبور کرتے تھے، اس طرح انہوں نے علم موسیقی دیووں سے سیکھا، عہد قدیم میں سنسکرت زبان میں مرتبہ نغمات مندروں اور مہاراجاؤں کے دربار میں پوجا کی نیت سے گائے جاتے تھے، ان نغمات کو گیت یا سنگیت کہتے تھے، برسوں بعد اوجین کے سامراٹھ راجہ مان (۱) نائک و نائکہ کی داستان پر مشتمل گوالیاری زبان میں بھیرون راگ کے اصول پر ایک دھرپد تصنیف کی اور اسے چرجو (۲) نائک کے سامنے جو اس زمانے میں اپنے فن میں معروف و ممتاز تھا گایا، نائک نے اسے سنا، سر کو جنبش دی اور عمیق و طویل تفکر میں ڈوب گیا، راجہ نے کہا کہ میرے ذریعہ سنگیت کی ایک نئی صنعت کا ظہور ہوا ہے، یہ تحسین و آفرین کا موقع ہے، پھر یہ تشویش و تردد کس لیے؟ نائک نے سر اٹھا کر کہا کہ یہ تحسین کا محل کس طرح ہے، ہمارے علم کو جو صدیوں سے مروج و متداول تھا اسے تو نے آج معطل کر دیا، اگرچہ سنگیت کا اثر و نفوذ لوگوں کے دلوں پہ بہت محکم ہے لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ جب اس کے مطالب بے پردہ ہو کر مرد و زن کی زندگی میں شامل ہو جائیں گے اور بہت جلد سمجھ میں آنے والی عبارتوں میں یہ ادا ہوں گے تو سنگیت کے دشوار اور پُر اسرار طریق کی جانب کون متوجہ ہوگا اور ہاں ہوش میں آؤ کہ ایک گناہِ عظیم تم سے سرزد ہوا ہے اور وہ یہ کہ عبادت کو تم نے لذت میں تبدیل کر دیا۔

کیوں کہ عشرت کوش و عیش طلب لوگ اسے عالم مجاز میں اتار کر حقیقت سے غافل ہو جائیں گے، نائک کے کلمات سن کر راجہ بہت پشیمان ہوا، اس کا تالیف کردہ دھرپد عامیوں کی زبان پر آپہنچا اور راجۂ مذکور کی تقلید میں بہت سے کلاکاروں نے دھرپد مرتب کر کے عیش و نشاط کی محفلیں گرم کیں، اب نائکوں کو دھرپد مرتب کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

پھر ایک مدت کے بعد سلطان حسین شرقی (۳) نے چار مصرعوں پر مشتمل دھرپد میں تخفیف کر کے اسے دو مصرعے پر مقرر کیا، اس کے باوصف آہنگ میں بھی جدت و تصرف سے کام

---

(۱) ۸۹۱ھ میں گوالیار کا والی ہوا، ۹۰۹ھ میں اس کی وفات ہوئی، فنِ موسیقی میں اس کی خدمات لائق ستائش ہیں (۲) راجہ مان کے دربار کا معروف موسیقی شناس (۳) جون پور کے شرقی خاندان کا آخری بادشاہ، متوفی ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹ء، اسے بارہ راگنیوں کا موجد سمجھا جاتا ہے۔

لے کر اسے رنگین تر بنایا اور اسے خیال و چٹکلہ کے ناموں سے موسوم کیا اور اس طرح عالم مجاز کی باتوں کو صریح تر بنا کر پیش کیا۔

اس کے بعد گردش زمانہ جب جدید صنعت کی متقاضی ہوئی تو نائک گوپال جو سنگیت کلا میں بڑی مہارت رکھتا تھا، دکن کی جانب سے ادعا کے زعم کے ساتھ دہلی کے لیے عازم سفر ہوا، نقل ہے کہ سترہ سو پالکی سوار اس کے ہم راہ تھے، جس شہر میں وہ پہنچتا وہاں کا حاکم نقد و جنس جو بھی اس کے دستیاب ہوتا، بطور ہدیہ اس کی خدمت میں پیش کرتا، یہاں تک کہ دہلی پہنچ کر وہ سلطان محمد تغلق کے ملازموں میں شامل ہوا اور اپنے فنی فضل و کمال کے زور پہ پایہ تخت کے جملہ موسیقی دانوں پر فوقیت حاصل کی۔

سلطان اس صورت حال کو دیکھ کر بہت ملول ہوا اور اس امر سے متعلق امیر خسرو سے مشورہ کیا، چنانچہ مشہور ہے کہ سلطان نے ایک شب امیر خسرو کو تخت کے نیچے پنہاں رکھا، نائک گوپال نے نغمہ چھیڑا، امیر خسرو نے اپنی فراست و زیرکی سے نائک کے سنگیت کے قواعد کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا اور الفاظ میں تغیر و تبدل پیدا کر کے چند دل انگیز قول مرتب کیے اور اسے قول اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ابتدا میں حضرت نظام الدینؒ کا ایک قول (۱) ''الا کل شی ما عدا لہ باطل'' اس میں درج کیا گیا تھا۔

دوسرے روز امیر خسرو نے سلطان کی مجلس میں چند قول نائک گوپال کے حضور میں پیش کیے، نائک کو بڑا تعجب ہوا اور کہا کہ اگرچہ مجھے یقین کامل ہے کہ میرے ہنر کی پیش کش سے یہ چرایا گیا ہے مگر اس طور چوری کی گئی ہے کہ میں سمجھنے سے قاصر ہوں، اس وقت سے قول کی شہرت ہونے لگی اور نائک گوپال خدا کی قدرت کاملہ کے معترف ہو کر دکن کی جانب مراجعت کی راہ پر چل پڑا، سلطان نے اسے خطیر انعامات سے سرفراز کیا۔

یہ تھا فن موسیقی کے مقدمات کا ایک مجمل جائزہ جس کی واقفیت مختصر طور پر اس سے مناسبت

---

(۱) ہوشیار ہو جاؤ خدا کے سوا دنیا کی ساری چیزیں باطل ہیں، (معارف: یہ دراصل مصرعہ ہے، پورا شعر اس طرح ہے جو حضرت ابوبکرؓ سے منسوب کیا جاتا ہے ؎

الا کل شی ما خلا اللہ باطل و کل نعیم لا محالۃ زائل)

پیدا کرتی ہے، سارے علم و دانش کا حصول پیہم تحقیق و تتبع پر مبنی ہے اور ہر علم زبان و ذہن کے ذریعہ سیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، فرنگی دانش مندوں نے بھی آلات موسیقی ایجاد کیے ہیں جن کو وہ کتابوں میں مندرج اشارات کی مدد سے حرکت میں لاتے ہیں اور صوتی اتصال اور آہنگوں کے زیر و بم سے موسیقی کے راگ اور مقام جس طرح چاہتے ہیں مرتب کرتے ہیں۔

منابع و مآخذ

۱۔ خلاصۃ الافکار، مخطوطہ خدا بخش، شمارہ ۲۵۷، فارسی نمبر ۲۱۹۔ ۲۔ مسیر طالبی فی بلاد افرنجی، مخطوطہ خدا بخش، شمارہ ۶۲۷۔ ۳۔ ہسٹری آف انڈیا، مرتبہ ایلیٹ و ڈاوسن، جلد ہشتم۔ ۴۔ فہرست کتاب خانہ بوڈلین۔ ۵۔ مفتاح التواریخ مطبوعہ، مرتبہ طامس ولیم بیل، مطبع نول کشور، کانپور۔ ۶۔ تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان، معنفہ ڈاکٹر علی رضا نقوی، مطبوعہ۔ ۷۔ سفینۂ ہندی مطبوعہ، تصنیف بھگوان داس ہندی، مرتبہ سید شاہ عطاء الرحمان، پٹنہ۔ ۸۔ سرمایۂ عشرت مطبوعہ، مصنفہ صادق علی خان، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۹۔ گلدستۂ موسیقی مطبوعہ، مصنفہ منشی رام بھجولال، فیض عام پریس، لکھنؤ۔ ۱۰۔ رسالہ آج کل (موسیقی نمبر) اگست ۱۹۵۶ء۔ ۱۱۔ پرشین لٹریچر، مرتبہ سی۔ اے اسٹوری، بخش ۲ صفحہ ۱۴۴۔

انسی قندھاری: عہد بابر و ہمایوں کا ایک فارسی شاعر

پروفیسر شریف حسین قاسمی ☆

فارسی شعرائے احوال اور ان کے کلام پر اجمالی تبصرے کے لیے فارسی شعرا کے تذکرے ناگزیر ہیں، کیوں کہ متعدد شعرا کے دواوین اور دیگر آثار حتیٰ کہ خطی نسخے بھی اب دست یاب نہیں، لیکن ان کے بارے میں بنیادی اطلاعات اور ان کے کلام کے نمونے ان تذکروں میں محفوظ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر فارسی شعرا کے یہ تذکرے لکھے نہ گئے ہوتے تو بے شمار ایسے شعرا کے نام بھی، جن کا ذکر اور نمونہ کلام، خواہ مختصر اور پُر غلط ہی سہی، جو ان تذکروں میں محفوظ ہے، ہم تک نہ پہنچتے۔

فارسی رسم الخط کی بعض کمزوریوں، کچھ کاتبوں کی بے توجہی اور بعض اوقات خود تذکرہ نگاروں کی بے اعتنائی کی وجہ سے ان تذکروں میں ایسے اشتباہات بھی نظر آتے ہیں جو معمولی توجہ سے دور کیے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر خوش گو نے اسیری شیرازی کو امیر قاضی اسیری رازی سمجھا، اسی طرح تذکرہ محبوب الزمن میں الفتی ساوجی اور الفتی یزدی کے تراجم میں فرق نہیں کیا گیا، یہی صورت حال انسی قندھاری کے ساتھ بھی پیش آئی ہے، ان کا پورا نام مولانا محمد شاہ اور تخلص انسی تھا، ایک تذکرے میں انسی کو انیسی کے تخلص سے متعارف کرایا گیا ہے اور کہیں ان کا تخلص آتش یا آتشی لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، ظاہر ہے اس خلط مبحث میں کہیں کاتب کا قصور اور کہیں مطالب کے درج کرنے میں مولف تذکرہ کی غیر تحقیقی روش کارفرما ہے، اس نوعیت کے اشتباہ و التباس کی ایک

☆ شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ بعد کے دور کے بیش تر تذکرہ نگاروں نے محض قدیم تر تذکروں پر بھروسہ کیا اور ان میں موجود اشتباہات کو بغیر جانے بوجھے اپنے تذکروں میں دہرایا، اس کے علاوہ چوں کہ انسی کی کوئی تالیف دست یاب نہیں تھی، اس لیے ان کے احوال و آثار کے بارے میں تذکرہ نگاروں کو مجبوراً صرف قدیم تر تذکروں ہی پر اکتفا کرنا پڑا، اگر انسی کی کوئی تصنیف تذکرہ نگاروں کی نظر سے گذرتی تو امکان تھا کہ کوئی تذکرہ نگار اس کا مطالعہ کرتا اور اس تصنیف اور صاحب تصنیف کے بارے میں درست اطلاعات بہم پہنچاتا۔

یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے محض قدیم تر تذکرے سامنے رکھ کر اپنے اپنے تذکرے ترتیب دیے ہیں، بعض عمومی تذکروں میں شعرا کے تراجم کی تعداد دو ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی ہے، ان کے مؤلفین سے یہ توقع رکھنی کہ وہ اپنے تذکرے میں شامل ہر شاعر کے احوال خود تحقیق کے بعد لکھیں گے اور شعرا کے تمام یا چند آثار کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں گے، یہ ظاہر ہے جا ہے، ایسے کتاب خانے جن میں تمام شعرا کے تمام آثار موجود ہوں، نہ گذشتہ زمانے میں موجود تھے اور نہ آج ہیں، ایسی صورت حال کے پیش نظر شعرا کے تذکرے رطب و یابس، تکرار مطالب، اشتباہات وغیرہ کا شکار ہیں۔

انسی قندھاری کے احوال معاصر، قریب العہد اور بعد کے تذکروں میں بھی درج ہیں، میر علاء الدولہ کامی قزوینی غالباً وہ سب سے پہلا معاصر تذکرہ نگار ہے جس نے اپنے تذکرے نفائس المآثر (۱) میں انسی کے احوال لکھے ہیں، کامی نے انسی سے لاہور میں ملاقات کی تھی اور ان سے کسب فیض کیا تھا، وہ انسی کے بارے میں لکھتا ہے:-

''مولانا محمد شاہ کا تخلص انسی ہے، یہ قندھار کے ارباب زادوں (شرفا، مکھیا) سے تعلق رکھتا ہے، عنفوانِ شباب ہی سے فردوس مکانی (بابر بادشاہ) کے سایۂ عاطفت میں نشو و نما پائی اور ایک مدت تک اسی بادشاہ کا واقعہ نویس رہا، جنت آشیانی (ہمایوں) کے دو بار سے بھی وابستہ اور مناسب مناصب پر فائز رہا،

اس بادشاہ کے مخصوص مصاحبوں میں شامل تھا، انسی نے ہمایوں کی عالی مجالس
میں کسب کمال کیا، انسی اس ملک کے مشاہیر میں شمار ہوتا ہے، راقم کو لاہور میں
ان سے ملاقات اور کسب فیض کا موقع ملا، یہ لطیف طبع اور شیریں ادا کا مالک
تھا۔ شعبان کی دس تاریخ ثلث وسبعین وتسعمائۃ (۹۷۳) میں لاہور میں
فوت ہوا" (۲)۔

ملا قاطعی ہروی دوسرا معاصر تذکرہ نگار ہے جسے انسی سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ یہ اپنے
تذکرے مجمع الشعرائی جہاں گیر شاہی میں انسی کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"ملا شاہ انسی جنت آشیانی (ہمایوں) کا واقعہ نویس تھا، جب ہمایوں
آگرہ میں تخت نشین ہوا (تو اس کی خوشی میں جشن منایا گیا) دریائے جمنا میں امرا کی
کشتیاں اس طرح نظر آرہی تھیں جیسے آسمان پر ستارے جگمگا رہے ہوں، دریا کی سطح
کشتیوں، چراغوں، فانوسوں اور مشعلوں سے آسمان کی طرح روشن و درخشندہ تھی، ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ پانی پر آسمان کا عکس پڑ رہا تھا، اس وقت انسی نے یہ مطلع کہا:

بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن   سر شکم رفتہ رفتہ بی تو دریا شد، تماشا کن

مولانا اپنے دور کے خوش طبع افراد میں شمار ہوتے تھے"۔

قاطعی نے اس شعر میں انسی کے علم و فن کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

گشتہ گلزار فصاحت راز شعرش رنگ و بو   آن کہ بازار بلاغت را رواج از نظم اوست

قاطعی نے جہاں انسی کی فن شاعری میں تعریف کی ہے وہاں وہ ان کی کم ہمتی اور فن
سپاہ گری میں عدم مہارت کا مذاق اڑایا ہے، وہ ان کی بزدلی کے بارے میں یہ دلچسپ واقعہ
بیان کرتا ہے:۔

"ایک بار مجھے حرمین شریفین جانے کا خیال آیا، انسی نے بھی جانے کا
ارادہ کر لیا تھا، اتفاق سے ایک گروہ پہلے ہی سے اس خطرناک راستے پر جارہا تھا
جہاں افغان لٹیروں کا ڈر لگا رہتا تھا، انسی بھی اس گروہ میں شامل تھے، ان کے

پاس بہت سی اشرفیاں تھیں جو انھوں نے اپنے جبہ میں سی رکھی تھیں، اس جبہ کے
اوپر انھوں نے ایک ظریفانہ لبادہ اوڑھ رکھا تھا، انسی ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار
تھے، افغان لٹیروں نے ابھی حملہ کیا بھی نہیں تھا کہ مولانا نے (بے بنیاد خدشہ پر
ہی) اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑایا اور نہایت تیز رفتاری سے دس گروہ (کوس) دور
ایک محفوظ مقام پر پہنچ کر دم لیا، انسی کو سپاہ گری میں یہ جرأت حاصل تھی، قاطعی
اپنے ہم سفروں جیسے میرزا عسکری کے کوکہ چلمہ بیگ (۳)، کمال الدین حسین
کتاب دار اور خواجہ کلاں سوداگر کے ہم راہ انسی سے سیوی (؟) کے مقام پر آن
ملے، سب نے انسی کی تیز رفتاری کی تعریف کی (یہ طنز تھا)، انسی کا بڑا لڑکا میر حسین
اور بڑا پوتا (نبیرہ) میر محمد قاسم کا شمار بھی خوش طبع افراد میں ہوتا ہے، یہ نواب قلیج
خان کی سرکار سے وابستہ ہیں اور در حقیقت باادب، خلیق اور کریم جوانوں میں شمار
ہوتے ہیں، قاطعی کے بقول انسی صاحب دیوان شاعر ہیں اور ان کا کلام دل ربا
اور جاں فزا ہے" (۴)۔

ملا عبد القادر بدایونی نے بھی انسی کے مختصر حالات فراہم کیے ہیں، انھوں نے منتخب
التواریخ میں انسی کے بارے میں جو اطلاعات بہم پہنچائے ہیں اور انسی کے جو اشعار نقل کیے ہیں،
وہ بہ ظاہر نفائس المآثر سے ماخوذ ہیں، لیکن مطبوعہ منتخب التواریخ میں ملا شاہ کا تخلص انسی کے بجائے
آتشی درج ہے، جو بہرحال کتابت و طباعت کی غلطی ہے، بعد کے جن تذکرہ نگاروں نے انسی کے
احوال بدایونی سے نقل کیے ہیں، انھوں نے بھی ملا شاہ کا تخلص آتشی درج کیا ہے جو صحیح نہیں ہے،
بدایونی نے بہرحال یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ایک بار ہمایوں قلعہ ظفر میں ایک بیماری میں مبتلا ہو گیا
جب اسے صحت حاصل ہوئی تو انسی نے یہ رباعی کہی:

صد شکر کہ شاہ از غم بیماری رست   برخاست و بر مسند اقبال نشست
از صحت ذاتش خبری می گفتند   المنۃ للہ کہ بہ صحت پیوست (۵)

والہ داغستانی نے ریاض الشعرا (۶) اور عاشقی عظیم آبادی نے نشتر عشق (۷) میں مولانا
محمد شاہ کا تخلص بہرحال انسی ہی ثبت کیا ہے، والہ نے لکھا ہے کہ انسی ہمایوں کے عہد میں ماوراء النہر

سے ہندوستان آیا جو صحیح نہیں، لیکن نشتر عشق میں نفائس المآثر، منتخب التواریخ اور مجمع الشعرای جہاں گیر شاہی کے مطابق یہ درست اطلاع دی گئی ہے کہ انسی بابر کے ہم راہ ہندوستان آیا، ہمایوں سے بھی وابستہ رہا، واقعہ نویسی پر مامور تھا اور لاہور میں دس شعبان ۹۷۳ھ میں فوت ہوا، عاشقی نے اس کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ بھی نظم کیا ہے:

انسی خوش کلام معنی داں سوی دار القرار شد عازم
در غمش عاشقی چلید و گفت ہای انسی بہ رفت از عالم (۹۷۳)

بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی ملا شاہ کے تخلص میں کسی خاص تحقیق سے کام نہیں لیا، روز روشن (۸) میں ان کا تخلص انسی، تاریخ شعر وسخن وران فارسی در لاہور (۹) میں آتشی اور تذکرۂ شعرای پنجاب (۱۰) میں انسی درج ہے، ان سب تذکروں میں قدیم تر تذکروں ہی سے نقل واقتباس کیا گیا ہے، اس لیے انسی کے بارے میں کوئی نئی اطلاع ان میں مفقود ہے، تاریخ شعر وسخن وران فارسی در لاہور میں بہر حال اس اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ممکن ہے بابر و ہمایوں کے دور حکومت میں لاہور میں بعض دوسرے فارسی شاعر رہے ہوں، لیکن سوائے آتشی (یعنی انسی) کے کسی دوسرے شاعر کے بارے میں اطلاع دست یاب نہیں، تاریخ شعر وسخن وران فارسی در لاہور کے مصنف کو یہ یقین ہے کہ محمد شاہ کا تخلص آتشی تھا اور بعد کے تذکرہ نگاروں نے اسے انسی یا انیسی لکھا ہے جو آتشی کی تصحیف ہے (۱۱)۔

مختلف تذکروں میں انسی کے مندرج احوال سے پتا چلتا ہے کہ وہ بابر کے ہم راہ ہندوستان آیا، واقعہ نویس کی حیثیت سے اس کے دربار میں خدمات انجام دیتا رہا، بابر کے انتقال کے بعد ہمایوں نے بھی اس کو اسی منصب پر برقرار رکھا اور غالباً انسی کے اپنے والد بابر سے خاص تعلقات کی بنا پر اسے اپنے ندما میں بھی شامل کرلیا اور اسے مناسب مناصب پر فائز کیا، شیر شاہ کے ہاتھوں ہمایوں کی شکست اور پھر ہندوستان چھوڑ کر ایران میں پناہ گزیں ہونے کے دوران (۱۵۴۰/۹۴۶) انسی پر کیا بیتی، اس کا علم نہیں ہوسکا، لیکن ظاہر ہے کہ ہمایوں کی ہندوستان واپسی اور تخت سلطنت پر جلوس (۱۵۵۵/۹۶۲) کے بعد انسی ایک بار پھر ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوا ہوگا، انسی اکبر کے دور حکومت (۹۶۳/۱۵۵۶-۱۰۱۴/۱۶۰۵) کے اوائل میں بھی زندہ تھا، لیکن

اکبر یا اس کے دربار سے اس کی وابستگی کا علم بھی نہیں ہوتا، اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمایوں کے انتقال کے بعد لاہور میں گوشہ نشین ہوگیا ہوگا اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔

انسی کے دیوان یا کسی دوسری تصنیف کے موجود ہونے کا پتا نہیں چلتا، ان کے درج ذیل صرف چند اشعار جو تذکروں میں نقل ہوئے ہیں، ان سے فن شاعری میں ان کے مقام کا تعین مشکل ہے، اس کے باوجود ان چند اشعار سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رواں اور سلیس زبان و اسلوب میں شعر کہتے تھے اور غزل کا قابل قدر مذاق بھی رکھتے تھے۔

در شفق گشت شب عید نمایان مہ نو تا کنیم از پی جام می گلگوں تگ و دو

خنجر بہ میان، تیغ بہ کف، چین بہ جبین باش خوں ریز وستم (۱۲) پیشہ کن و بر سر کین باش
بکشای لب و ساز خجل تنگ شکر را بنمای رخ و اشک پری خانۂ چین باش
با آن لب شیریں شکرستان جہاں شو با روی چنیں ماہ ہمہ روی زمیں باش

از اہل وفا بی خبری را چہ کند کس مایل بہ جفا سیمبری را چہ کند کس

صد شکر کہ شاہ از غم بیماری رست برخاستہ بر مسند (۱۳) اقبال نشست
از صحت ذاتش خبری (۱۴) می گفتند المنۃ للّٰہ کہ بہ صحت پیوست

سرشکم رفتہ رفتہ بی تو دریا شد، تماشا کن بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن (۱۵)

حواشی

(۱) یہ تذکرہ ۹۹۸/۱۵۸۹ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس میں تین سو پچاس شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا مؤلف اکبر کے دور کا معروف صاحب علم وادب شخص تھا، اس نے اکبر کے دور کے متعدد شعرا اور ادبا سے ملاقات کی تھی، یہ تذکرہ ابھی تک شایع نہیں ہوسکا، تفصیل کے لیے رجوع کریں: تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان: ڈاکٹر علی رضا نقوی، تہران، ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۶-۱۰۸، کامی کے دو بڑے بھائی میر عبداللطیف (م ۹۸۱) اور قاضی صفی الدین عیسی بھی ایران سے ہندوستان منتقل ہوئے تھے۔ (۲) نفائس المآثر میں انسی کے احوال مجمع الشعرای جہاں گیر شاہی کے تعلیقات میں نقل ہوئے ہیں، راقم نے ان ہی تعلیقات

سے انسی کے احوال کا اردو خلاصہ پیش کیا ہے، (۳) متوفی ۹۷۴ھ/۶۷-۱۵۶۶ء، رک اکبر نامہ، دفتر ۲، ص ۲۹۷۔ (۴) مجمع الشعرای جہاں گیر شاہی: ملا قاطعی ہروی، تصحیح ڈاکٹر محمد سلیم اختر، مؤسسہ تحقیقات علوم آسیای میانہ و غربی، دانش گاہ کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۵۱-۵۲، تعلیقات ص ۲۲۱-۲۲۲۔ (۵) منتخب التواریخ (ج ۳) : عبدالقادر بدایونی، تصحیح ڈاکٹر توفیق سبحانی، تہران ۱۳۷۹۔ (۶) ریاض الشعرا: علی قلی والہ داغستانی، تصحیح ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، رام پور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳۔ (۷) نشتر عشق: آقا حسین قلی خان عاشق، تاجیکستان، ص ۶۴۔ (۸) روز روشن: محمد مظفر حسین صبا، بھوپال، ۱۲۹۷ھ، ص ۵۶۔ (۹) تاریخ شعر و سخن وران فارسی در لاہور: ڈاکٹر یمین خاں لاہوری، لاہور ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۹۔ (۱۰) تذکرۂ شعرای پنجاب: خواجہ عبدالرشید، کراچی ۱۳۴۶، ص ۲۰-۲۱۔ (۱۱) ص ۱۷۹ (۱۲) تذکرۂ شعرای پنجاب: جفا۔ (۱۳) ایضاً: برخاست و برمند۔ (۱۴) ایضاً: خبر (۱۵) ابوالفضل نے آئین اکبری میں یہ شعر ملا صبوحی چغتائی سے منسوب کیا ہے، رک: نشتر عشق، ص ۶۴۔

بزم تیموریہ

مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمان

حصہ اول: اس میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں میں سے بابر، ہمایوں اور اکبر کی علم دوستی، علما نوازی اور ان کے درباری شعرا و فضلا اور دوسرے اصحاب کمال کا تذکرہ۔

قیمت: ۱۵۰ روپے

حصہ دوم: اس حصہ میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں میں سے جہاں گیر اور شاہ جہاں کی علم دوستی، علما نوازی اور ان کے درباری شعرا، فضلا اور دوسرے اصحاب کمال کا تذکرہ ہے۔

قیمت: ۵۰ روپے

حصہ سوم: اس میں ہندوستان کے تیموری بادشاہوں میں شہنشاہ عالم گیر اورنگ زیب اور اس کے بادشاہوں اور شہزادیوں کے علمی و ادبی ذوق، ان کی علم دوستی و علم پروری و علما نوازی اور ان کے دربار کے شعرا و فضلا اور دوسرے ارباب فضل و کمال کا تذکرہ ہے۔

قیمت: ۵۶ روپے

وفیات

پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی

سخت افسوس ہے کہ پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی ۲۰ رجنوری ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، وہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے بڑے لائق اور ہونہار فرزندوں میں تھے، ندوہ سے فراغت کے بعد انہوں نے جدید تعلیم حاصل کی پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی میں لکچرر ہوئے اور ترقی کرکے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے، اس وقت فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین بھی تھے، جدید اور ماڈرن عربی میں ان کو مکمل دست گاہ تھی، ''مہجری ادب'' پر ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے اور بیرون ملک کے جراید و رسایل میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے، عربی زبان پر اچھی قدرت ہی کی وجہ سے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس کے سہ ماہی عربی رسالہ ثقافة الهند کے اڈیٹر مقرر کیے گئے تھے اور اس کا ایک ضخیم اور شان دار نمبر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر نکالا تھا۔

مولانا علی میاں اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا، دارالعلوم کے کاموں میں نہایت سرگرم اور پیش پیش رہتے تھے، اس کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بھی رکن تھے، اس کے اجلاس میں بڑے شوق اور دل چسپی سے شریک ہوتے تھے اور اس کے لئے متعدد بیرونی ملکوں میں بھی تشریف لے گئے، مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم ندوۃ العلما کو ان پر بڑا اعتماد تھا، ان سے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمد واضح ندوی سے بہت گھلے ملے رہتے تھے، علمی صلاحیتوں کے ساتھ ان میں انتظامی خوبیاں بھی تھیں۔

مرحوم بڑے مرنجاں مرنج، وسیع المشرب اور طبعاً شریف اور خوش مزاج تھے، ہر ایک

سے خندہ روئی سے ملتے، اپنی نیکی، وضع داری، اخلاص اور علم دوستی کی بنا پر بہت مقبول اور ہردل عزیز تھے، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود ان میں غرور اور گھمنڈ نہ تھا، راقم سے وہ اور ان کے بڑے مولانا ڈاکٹر محمود الحسن ندوی بڑی محبت کرتے تھے اور بعض موقعوں پر مدد بھی کی، ان کی مقبولیت کا اندازہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق صدر شعبہ فارسی کے ایک مکتوب کی ان سطور سے ہوگا:۔

''میں تقریباً ۲۵ سال ان کا رفیق شعبہ، فیکلٹی اور پڑوسی بھی رہا ہوں، ان کی علمی صلاحیت، انتظامی خوبیوں اور بے ریا اخلاص نے ان کو بہت مقبول بنادیا تھا چنانچہ اتنا بڑا جنازہ، تدفین، تعزیتی جلسہ جامعہ ملیہ کے تمام سابقہ رکارڈ توڑ گیا، دیگر یونیورسٹیوں، اساتذہ، اشخاص اور انجمنوں کی تعزیتی قراردادیں آج بھی روزناموں کا جز ہیں، خداوند تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے''۔

کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد رخصت ہوجائیں گے، ابھی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر ان المنایا للرجال بمرصد (موت لوگوں کی گھات میں رہتی ہے) اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بال بچوں پر رحم کرے اور بڑے بھائی اور سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

بیگم حمیدہ سلطان احمد

یہ خبر بہت افسوس سے سنی جائے گی کہ ۱۹؍جنوری ۲۰۰۳ء کو مشہور علم وادب نواز اور اردو کی ادیبہ بیگم حمیدہ سلطان احمد کا دہلی میں انتقال ہوگیا، وہ دہلوی تہذیب اور اردو ثقافت کی آخری یادگار تھیں۔

وہ ۷؍اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئی تھیں، دہلی کے محلہ گلی قاسم جان میں نواب احمد بخش والی فیروز پور جھرکہ لوہارو کے چھوٹے صاحب زادے نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی حویلی

میں ان کی پیدائش ہوئی، ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے ان کا خاندان بڑا معزز تھا، بیگم صاحبہ کا ننھیالی تعلق نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تھا، مرزا صاحب نے اپنی بیوی امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے ایک صاحب زادے زین العابدین خاں عارف تھے جن کو مرزا غالب نے متبنیٰ بنالیا تھا، ان کے ایک صاحب زادے باقر علی خاں کی چھوٹی صاحب زادی رقیہ بیگم حمیدہ سلطان احمد کی والدہ تھیں، ددھیال کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے، مغل بادشاہوں کے زمانے میں اس خاندان کے لوگ دہلی آئے تھے، اورنگ زیب کی فوج جب آسام کی مہم پر روانہ ہوئی تو اس خاندان کے ایک بزرگ بھی فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور ضلع سب ساگر کے ایک گاؤں میں آباد ہوگئے، ان ہی کی نسل کے لیفٹننٹ کرنل ذوالنور علی احمد سے جو ایک بہت کامیاب ڈاکٹر تھے رقیہ بیگم کی شادی ہوئی تھی، یہی ذوالنور علی احمد صاحب حمیدہ سلطان احمد مرحومہ اور ان کے بڑے بھائی اور سابق صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد صاحب کے والد بزرگوار تھے۔

حمیدہ سلطان صاحبہ کی شخصیت کی تشکیل اور ذہنی تربیت میں ان کے خاندان کے علمی و ادبی ماحول کا کافی اثر تھا، انہوں نے آزادی کے بعد اردو تحریک کی قیادت سنبھالی اور اس کے تحفظ کے لیے بڑی قربانی دی، وہ انجمن ترقی اردو کی دہلی شاخ کی برابر سکریٹری رہیں اور اس کے لیے ''علی منزل'' کے نام سے ایک عمارت حاصل کی جس کے ایک حصہ میں خود بھی رہتی تھیں، یہاں وہ انجمن کے زیر اہتمام ادبی محفلیں اور مشاعرے کراتی تھیں، اس کی وجہ سے وہاں بڑے ادیبوں اور شاعروں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں بھی ان کا عمل دخل رہا، وہ ہر سال غالب کی وفات ۱۵؍ فروری کو مرزا غالب پر تعزیتی جلسہ بھی کراتی تھیں، غالب کے خاندان سے اپنے خاندانی تعلق کا حق ادا کرنے کے لیے انہوں نے خاندان لوہارو کے شعرا کے نام سے ایک مستند کتاب بھی لکھی تھی، جس میں پہلے خاندان کی تاریخ اور حالات درج ہیں پھر اس کے شعرا کا تذکرہ ہے، مرحومہ نے کئی دلچسپ سماجی ناول بھی لکھے اور ان کے منتخب افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا، ان کی ان کتابوں پر دہلی اور اتر پردیش وغیرہ کی اکیڈمیوں نے انعامات دیے مگر انھوں نے قبول نہیں کیا

اور کہا کہ "جب تک حکومت اردو کو اس کا جائز حق نہیں دے گی، میں اس طرح کا کوئی انعام قبول نہیں کروں گی"۔

مرحومہ ایک مہذب، شائستہ اور شریف گھرانے کی فرد ہی نہیں تھیں بلکہ خود بھی دیانت دار اور پرانے ادبی و تہذیبی ورثے کی امین اور اخلاقی روایات و اقدار کی پاسبان تھیں، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

پروفیسر انامری شمل

پروفیسر انامری شمل کی وفات علمی دنیا کا بڑا سانحہ ہے، ۲۷ رجنوری کو اپنے گھر میں گر جانے کی وجہ سے ان کی وفات ہوگئی، وہ اس عہد کے ممتاز مستشرق تھیں، یورپ کی متعدد زبانوں کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور ترکی کی بھی ماہر تھیں، عربی میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا اور قریباً ۵۰ کتابیں لکھیں۔

انہوں نے اپنی تمام عمر تحقیق اور علمی کاموں کے لئے وقف کردی تھی، مشرقی اور اسلامی علوم پر ان کی اچھی نظر تھی، ہندوستان کئی بار تشریف لائیں اور یہاں کے اصحاب علم و ذوق کو ان سے استفادے کا موقع ملا، اورینٹل اسٹڈیز میں انہوں نے جہاں مختلف مشرقی زبانوں پر کام کیا تھا وہاں اردو، غالب اور اقبال بھی ان کے مرکز توجہ رہے، ان کی وفات سے مشرقی زبانوں اور اردو کا بڑا نقصان ہوا، اس خلا کا پُر ہونا مشکل ہے۔

مولوی مفتی نسیم احمد قاسمی

یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا کہ امارت شرعیہ بہار، جھارکھنڈ اڑیسہ کے نائب ناظم مولوی مفتی نسیم احمد قاسمی نے ۳۰ رجنوری کو داعی اجل کو لبیک کہا، وہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام کے خاص تربیت یافتہ تھے، فقہی اور ملی مسایل پر ان کے اچھے مضامین لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کررہے تھے۔

امارت کے کاموں میں بھی بڑے مستعد، کارگزار اور چاق چوبند رہتے تھے، ان کی وفات سے اسے بڑا دھکا پہنچا۔

ابھی ان کی عمر ۳۷ برس تھی، یہ بھی کوئی جانے کے دن تھے مگر مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل دے اور امارت کو ان کا بدل مہیا کرے آمین۔

"ض"

دارالمصنفین کا سلسلۂ تذکرہ و سوانح

۱۔	الفاروق مکمل	علامہ شبلی نعمانی	95/-
۲۔	الغزالی (اضافہ شدہ اڈیشن)	" "	120/-
۳۔	المامون	" "	50/-
۴۔	سیرۃ النعمان	" "	130/-
۵۔	سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندوی	32/-
۶۔	سیرت عائشہ	مولانا سید سلیمان ندوی	90/-
۷۔	حیات شبلی	" " "	160/-
۸۔	امام رازی	مولانا عبدالسلام ندوی	45/-
۹۔	حضرت خواجہ معین الدین چشتی	سید صباح الدین عبدالرحمن	10/-
۱۰۔	حضرت ابوالحسن ہجویری	" "	5/-
۱۱۔	حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	140/-
۱۲۔	مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمن	25/-
۱۳۔	تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	65/-
۱۴۔	تذکرۃ المحدثین (دوم، جدید اڈیشن)	" " "	160/-
۱۵۔	تذکرۃ المحدثین (سوم)	" " "	70/-
۱۶۔	یاد رفتگاں	مولانا سید سلیمان ندوی	75/-
۱۷۔	بزم رفتگاں (دوم)	سید صباح الدین عبدالرحمن	35/-
۱۸۔	صوفی امیر خسرو	" " "	30/-
۱۹۔	تذکرۃ الفقہاء (اول)	حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی	95/-
۲۰۔	تذکرۂ مفسرین ہند (اول)	مولانا محمد عارف عمری	60/-
۲۱۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	110/-

الادبیات

مناجات در رباعیات

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی ☆

روز و شب کا صبح و مسا کا یارب — دیکھا تری دنیا کا تماشا یا رب
جو دل پہ گزرتی ہے ، ہے تجھ کو معلوم — حیراں ہوں کہ میں کس سے کہوں کیا یارب

زہراب کے گھونٹ پی رہا ہوں یارب — جیسے بھی تو جلائے ، جی رہا ہوں یارب
بے ساختہ کبھی نکل جاتی ہے آہ — ہر چند کہ لبوں کو سی رہا ہوں یارب

جس حال سے بھی گزر رہا ہوں یارب — دن زندگی کے پورے کر رہا ہوں یارب
جانے گا کون اس کو اب تیرے سوا — جیتا ہوں کہ مر رہا ہوں یا رب

خوش خلق ہوں میں یا کہ بدخو یارب — واقف مرے احوال سے ہے تو یارب
کب تک ہیں یہی تلخیاں مری قسمت میں — کب تک رووٴں میں خوں کے آنسو یارب

توحید و رسالت کا ہوں قائل یا رب — بے ریب وخطا ہوں آخرت پہ مائل یارب
شیطان کے مکر وفن سے بچنے کے لیے — ہوں تجھ سے ، ترے کرم کا سائل یارب

کیا مجھ سے تری حمد و ثنا ہو یا رب — حق شکر کا کس طرح ادا ہو یا رب
کر دور ، مرے ذہن سے سب فکروں کو — بس پیش نظر تیری رضا ہو یا رب

ہیں بس میں ترے ، سارے عوامل یارب — طوفاں کو بنا دے مرے ، ساحل یارب
ہر کشمکش زیست سے دے مجھ کو اماں — حل کردے ، مرے سارے مسائل یارب

☆ ہاؤس نمبر ۴/۱۱۸/۱، اے، لوکو کالونی (نئی آبادی) علی گڑھ۔

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

الصحوة الاسلامیه (عدد ممتاز عن الامام الندوی): رئیس التحریر جناب محمد نعمان الدین ندوی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۹۰، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: الصحوۃ الاسلامیہ، دارالعلوم حیدرآباد، شیورام پلی، حیدرآباد، اے۔پی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں متعدد رسائل کے خاص شمارے شایع ہوئے، ان میں تعمیر حیات، بانگ درا، الشارق، نوائے ادب، تذکیر، فکر اسلامی وغیرہ رسائل کے شمارے مضامین ومقالات ومشمولات کے اعتبار سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن میں سید ندویؒ کی حیات، تالیفات وتصنیفات اور قومی وملی خدمات کے قریب ہر گوشے کا احاطہ کیا گیا، عربی زبان میں ندوہ کے موقر عربی مجلہ البعث الاسلامی نے بھی بلند پایہ خاص نمبر شایع کیا جس میں علامہ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر محمد عبید یمانی، ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح اور عالم عرب واسلام کے بیسیوں اہل علم وقلم کی تحریریں اور تاثرات شامل ہیں، زیر نظر خاص شمارہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں شیخ عمر بن محمد السبیل، ڈاکٹر عبداللہ بن عبد المحسن الترکی، ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کے مضامین کے علاوہ بعض اہم اردو مضامین کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا ہے، یہ اور دیگر تمام شمارے سید ندوی سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یقیناً مفید اور کارآمد ثابت ہوں گے۔

سہ ماہی حرا (اردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ): مدیر جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۳۲، قیمت: ۱۵۰ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، پتہ: المعہد العالی الاسلامی ۱۲/۴۱/۲-۱۶، اکبر باغ، سعید آباد، حیدرآباد، اے۔پی۔

چند سال قبل حیدرآباد میں تعلیم و تربیت خصوصاً تصنیف و تالیف کے ذوق کی آبیاری کے لیے المعہد العالی الاسلامی کا قیام عمل میں آیا، رسالہ حرا اس کا ترجمان ہے، اس کے زیر نظر خاص شمارے کو قرآن و حدیث، کلام و فقہ کے موضوع پر اردو کے پر ثروت سرمایے کے مطالعے کے لیے خاص کیا گیا، تمام مضامین طلبہ کے قلم سے ہیں اور ان کی عمدہ تحقیقی کاوشوں، وسیع مطالعہ اور سنجیدہ تصنیفی ذوق کا آئینہ ہیں، قرآن و حدیث و فقہ، اردو تراجم، تفاسیر، شروح احادیث کے علاوہ عیسائیت، قادیانیت اور ہندو دھرم سے متعلق کتابوں کی تفصیلات دی گئی ہیں، کوشش یہی کی گئی ہے کہ ہر موضوع پر زیادہ سے زیادہ معلومات یکجا کیے جائیں، مکمل استقصاء آسان نہیں، علوم قرآنی سے متعلق کتابوں کے ذکر میں مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی کتاب ایضاح القرآن کا نام نہیں، اسی طرح تذکرۃ القراء مؤلفہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا ذکر بھی نہیں ہے، ریاض الصالحین کے مشہور ترجمہ زاد سفر کا نام بھی رہ گیا، فقہ کے سلسلے میں مولانا عبدالسلام ندوی کی تاریخ فقہ اسلامی کا ذکر ضروری تھا، فتاوی کے ضمن میں مولانا ارشاد حسین رام پوری کی مجموعہ فتاوی ارشادیہ بھی مذکور نہیں، کلام عقیدہ میں علامہ شبلی کی الکلام اور علم الکلام سے صرف نظر کرنا حیرت انگیز ہے، ان تسامحات کے باوجود اپنے موضوع پر یہ خاص نمبر قدر کے لائق ہے۔

سہ ماہی فکر اسلامی (معاصر فقہ اسلامی نمبر): مدیر جناب مولانا محمد اسعد قاسمی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۹۲، قیمت: خصوصی شمارہ ۱۰۰ روپے، سالانہ ۸۰ روپے، پتہ: مرکز دعوت و ارشاد دارالعلوم الاسلامیہ، بستی، یو۔پی۔

۲۰۰۰ء میں مجمع الفقہ الاسلامی کا ایک اہم سمینار بستی میں ہوا، اس موقع پر رسالہ فکر

اسلامی نے معاصر فقہ اسلامی کے عنوان سے اس خاص نمبر کو شایع کیا، ہندوستان کے فقہا، کتب فقہ و فتاوی اور فقہی اداروں کے علاوہ عالم اسلام کے چند ممتاز فقہائے دور حاضر کے متعلق بہترین اور پُر از معلومات مقالے یکجا کردیے، مولانا عبدالحئی فرنگی سے مولانا محمد شفیع تک بارہ ممتاز فقہاء اور نو مجموعہ ہائے فتاوی کے مطالعہ و تجزیہ نے اس شمارے کی قدر و قیمت بلند کردی ہے، مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کے متعلق مولانا بدر احمد مجیبی کی تحریر خصوصاً کاغذی روپے کے متعلق مولانا فرنگی محلی کی رائے اور آج کے دور میں اس کی صحت و اہمیت پڑھنے کے لائق ہے، دوسرے مضامین بھی بلند پایہ ہیں، دیوبند کے علاوہ کچھ اور مکاتب فکر کی فقہی خدمات کے مطالعے اور تجزیے کی بھی ضرورت تھی، افسوس ہے کہ یہ گوشہ بالکل تشنہ رہ گیا۔

ماہنامہ حیات نو (مولانا صدر الدین اصلاحی، حیات و خدمات): مدیر مسئول جناب نور محمد فلاحی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۲۰، قیمت: خصوصی شمارہ ۳۰ روپے، سالانہ ۵۰ روپے، پتہ: مجلہ حیات نو جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔

مولانا صدر الدین اصلاحی کا انتقال ۱۹۹۸ء میں ہوا، علوم القرآن کے غواص و شناور اور جماعت اسلامی سے دیرینہ وابستگی اور اہم دینی مسائل میں دقت نظر اور علمی لہجہ و اسلوب اور بے شمار تحریروں کی وجہ سے وہ ملک کے ممتاز اہل قلم میں شمار کیے جاتے تھے، جامعۃ الفلاح کے وہ اہم رکن اور ایک عرصے تک اس کے ناظم بھی رہے، یہ خاص شمارہ ایک فرض اور قرض کی ادائیگی ہے، اس میں تاثراتی مضامین کے علاوہ ان کی تفسیر تیسیر القرآن کے علاوہ جملہ تصانیف اور افکار و نظریات کا جائزہ بھی ہے جن سے ان کی ذاتی زندگی اور علمی خدمات کا عمدہ مرقع سامنے آجاتا ہے۔

"ع۔ص"

مطبوعات جدیدہ

آزاد ہندوستان، ماضی اور مستقبل: از خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۴۷۸، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

اردو اور انگریزی میں مضامین و مقالات کا یہ قابل قدر مجموعہ، خدا بخش لائبریری کے زیر اہتمام اس سمینار کا حاصل ہے جو آزادی کے جشن طلائی کے موقع پر ۱۹۹۸ء میں ہمدرد یونیورسٹی دہلی میں منعقد ہوا تھا، اس کا مقصد بھی واضح تھا کہ آزادی کے بعد کی کارکردگی کا ایسا جائزہ لیا جائے جو مستقبل کے امکانات پر اثر انداز ہو سکے، اردو مقالات میں میڈیا، فرقہ واریت، اردو اور تاریخ ہند اور انگریزی میں ان کے علاوہ جنگ، تعلیم، وفاقی ہندوستان جیسے مباحث شامل تھے، لیکن اصل موضوع ہندوستانی مسلمان اور ان کا مستقبل رہا، اس سلسلے میں قریب ہر مقالے میں حقائق کی روشنی میں غیر جانب داری اور دردمندی سے بحث کی گئی، مسلمانوں کی ناخواندگی اور معاشی پس ماندگی کے اصل اسباب اور اس راہ میں حکومتوں کی بے حسی اور اس سے بڑھ کر فرقہ واریت کے فروغ میں ان کی شعوری حوصلہ افزائی کا ذکر جرات سے کیا گیا، یہ احساس بھی غالب رہا کہ اب قومی ترقی کا تصور، مادیت سے متعلق ہو چکا ہے جس کا سماجی ہم آہنگی، روحانی ترقی اور تعمیر انسانیت سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے، قول و فعل کا تضاد آزاد ہندوستان کے رہنماؤں کی شناخت ہو چکا ہے، دو قومی نظریے کی مخالفت پر زور بیان صرف کیا جاتا رہا لیکن عملاً پہلے کانگریس نے اس تصور کو ہندوتو میں اور بعد میں دوسروں نے صرف اپنی ذات و برادری ہی میں محدود کر دیا، اس تفریق اور سرکاری فرقہ واریت کا بدترین نمونہ اردو زبان کا

قتل ہے جس کو ملک کے لیے صرف لسانی خسارہ ہی نہیں تہذیبی خسران سے تعبیر کیا گیا، ایک خاصا طویل مقالہ اردو زبان و ادب آزادی سے پہلے اور مابعد، کے عنوان سے ہے، معلومات کی کثرت کے باوجود اس میں جا بجا ذہن و فکر کی اور لب و لہجے کی ناہمواری نمایاں ہے، نادر شاہ کے حملے کو مقالہ نگار نے جاگیردارانہ نظام کی شکست و ریخت کا اصل سبب قرار دیا ہے جس کی وجہ سے سماجی اور مذہبی ادارے تباہ ہوئے اور بے روزگاری عام ہوئی لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رذیلوں اور نودولتیوں کا عروج ہوا اور ان رذیلوں میں انہوں نے مسلم معاشرہ کے ہر پیشہ ور طبقہ کو شامل کر لیا ہے، اردو کے عروج کو وہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا پھل قرار دیتے ہیں لیکن آگے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اردو کے زوال کی وجہ خود مسلمان ہیں کیوں کہ انہوں نے نہ عہد سلطنت میں اور نہ عہد مغلیہ میں کوئی قومی مفاد کی تعمیری کام کیا" عہد سلطنت کے مسلمانوں کو اردو کے زوال میں شامل کرنا حیرت انگیز تاریخی تحقیق ہے، سرسید کی خدمت میں انہوں نے مسلمانوں کے بعض پیشہ ور طبقوں کا جس تحقیر سے ذکر کیا ہے وہ اہل علم کے لیے زیبا نہیں، انہوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ عام مسلمانوں کو اردو سے ناانصافی سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ فارسی کو دفتری زبان ٹوڈرمل نے بنایا، شکر ہے کہ ایسے مہمل خیالات کا رد دوسرے مقالات سے ہو گیا ہے، تاریخ میں تحریف کے موضوع پر اردو اور انگریزی میں اچھی تحریریں آگئی ہیں، قریب بتیس مقالات کا یہ مجموعہ آزاد ہندوستان کے ماضی اور مستقبل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک وقیع دستاویز سے کم نہیں۔

عہد عالم گیر کے درباری اخبار: از جناب سید شاہ غازی الدین ایڈوکیٹ، قدرے چھوٹی تقطیع، کاغذ و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۹۱، قیمت: ۱۴۰ روپے، پتہ: ادارہ برائے مطالعہ و تحقیق تاریخ دکن، ۲۰۹ شنوار پیٹھ، شولاپور ۴۱۳۰۰۲۔

شاہان مغلیہ کے دربار میں اہم واقعات اور احکام و فرامین کو روزنامچہ کی شکل میں منضبط کرنے کا دستور تھا، ان کو اخبار بھی کہا جاتا ہے، گردش زمانہ کے ہاتھوں اب یہ اخبار نایاب ہیں، البتہ اس بیش قیمت ذخیرہ تاریخ کا کچھ حصہ اخبار اورنگ زیب کی شکل میں محفوظ رہ گیا جو جے پور

اور لندن میں موجود ہے، بعض مورخین نے اس سے استفادہ کیا، عہد اورنگ زیب سے خاص
دلچسپی کے پیش نظر مہاراشٹر کے ایک مورخ نے ان اخبار کا انتخاب، مراٹھی زبان میں تین جلدوں
میں شایع کیا، زیر نظر کتاب اس انتخاب کے اس حصے کا ترجمہ ہے، جس کا تعلق سرزمین دکن سے ہے
اور یہ ۱۶۸۱ء سے ۱۷۰۷ء تک کے بعض واقعات دکن پر مشتمل ہے، معرکہ آرائیوں کے علاوہ اس
میں عالم گیر کی ذاتی زندگی، خانگی حالات، کردار واخلاق، امرا ورؤسا، فوج ورعایا وغیرہ کے
متعلق ایسے معلومات ہیں جو مستند ہونے کے ساتھ بہت دلچسپ اور عہد عالم گیری کے مطالعہ میں حد
درجہ مفید ہیں، دربار میں اگر قبول اسلام کے واقعات ہیں تو عالم گیر کی مذہبی رواداری کی دل کش
تصویریں بھی جابجا نمایاں ہیں، رعایا کی خبر گیری، دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور عمر کے آخری
حصے میں بھی عزم وحوصلہ اور جفاکشی کی جھلکیاں ملتی ہیں، فاضل مترجم نے مقدمہ میں ان درباری
اخبار کی خوبیوں کو سلیقے سے بیان کردیا ہے، ان کا کہنا درست ہے کہ ضرورت اصل فارسی سے تمام
اخبار کے ترجمے کی ہے جس سے عالم گیر پر الزاموں کی تردید ہوسکے اور حیات عالم گیر کا معروضی
مطالعہ وتجزیہ آسان ہوسکے، کتابت وطباعت کے اغلاط اور زبان وبیان کے سقم کے باوجود اس
کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ (ایک تجزیاتی مطالعہ): مرتبہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی۔
متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۲۳، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: ادارہ
شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

قرآن وحدیث، فلسفہ وفقہ، تاریخ وتصوف اور دیگر فنون میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے
رسائل وتصانیف کی تعداد پچاس کے قریب ہے لیکن موضوع اور مواد کی جدت وانفرادیت کے
باعث حجۃ اللہ البالغہ کو سب سے زیادہ عظمت ومقبولیت حاصل ہوئی، اسرار شریعت وطریقت کی
جامع وشارح کتاب کی حیثیت سے یہ خواص اہل علم ونظر کا مرجع ومستفاد ہے، اسی اہمیت کے
پیش نظر مسلم یونیورسٹی کے شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل نے اپنے ایک مذاکرہ علمی میں اس کتاب کو
موضوع بحث بنایا، زیر نظر مجموعہ اسی سمینار کے مقالات پر مشتمل ہے، جس میں حجۃ اللہ البالغہ کے
موضوعات، مضامین ومباحث اور اسلوب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، علامہ شبلی، مولانا تھانوی،

مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دیگر علما کی بعض کتابوں اور تحریروں پر حجۃ اللہ کے اثرات کی مفصل
نشان دہی بھی کی گئی ہے، ایک محققانہ مضمون حجۃ اللہ البالغہ کے خطی ومطبوعہ نسخوں کی تفصیل میں ہے،
مضامین عموماً شاہ صاحب کے تبحر علم، غیر معمولی نکتہ سنجی اور عبقریت کے اقرار واعتراف سے [illegible]یز
ہیں لیکن کہیں کہیں بعض نقائص کی نشان[illegible]ن اور ان کی بعض تاویلات کو محل نظر بھی قرار دیا گیا ہے،
آیات قرآنی سے زیادہ احادیث سے ان کے استشہاد کو بھی نامناسب بتایا گیا ہے، نبوت اور اس
کے متعلقات کے متعلق شاہ صاحب نے اپنے رسائل میں بحث کی ہے اس کو بے ربط وبے ترتیب
بلکہ متضاد کہہ کہ حجۃ اللہ میں اس بحث کو فلسفیانہ اسلوب سے تعبیر کیا گیا ہے، اس طرح فکر ولی اللہی
سے روشناس ہونے کے لیے یہ مجموعہ زیادہ وسیع اور ہمہ گیر حیثیت کا حامل نظر آتا ہے، شریعت و
طریقت کی ثنویت بھی شاہ صاحب کے مطالعہ میں خاصی اہمیت رکھتی ہے، لیکن فاضل مرتب کے
نزدیک یہ قصور فہم ونظر ہے، حجۃ اللہ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ثبوت کا شائبہ تک نہیں پایا
جاتا، تاہم مجموعہ میں اس موضوع پر صرف ایک مقالے کے مشمولات سے تشفی نہیں ہوتی، شاہ
صاحب سے متعلق مفصل اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس سے افاد[illegible] اضا[illegible] ہے۔

فتاوی برائے خواتین: جمع وترتیب جناب محمد [illegible] المسند، ترجمہ و
تعلیق جناب مصیب الرحمن عطاء الرحمن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد،
صفحات ۴۴۳، قیمت: درج نہیں، پتہ: یونانی دواخانہ، ستار مارکیٹ، ڈومن پورہ
دکھن، مئو، یوپی۔

مسلمان خواتین سے متعلق اسلامی عقائد وا[illegible] پر مشتمل قریب تمام ضروری مسائل،
اس کتاب میں استفسار وجواب کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں اصلاً یہ ان فتاوی پر مشتمل ہے جو شیخ
عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد بن صالح العثیمین اور شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین نے وقتاً فوقتاً
سپرد قلم کیے تھے، یہ مجموعۂ فتاوی اپنی افادیت کے باعث مقبول ہوا اور اب اس کو سلیقے سے اردو
میں منتقل کیا گیا ہے، عقیدہ، علم، طہارت، نماز، جنازہ، زکوۃ، روزہ، حج، قربانی، نکاح، رضاعت،
طلاق، عدت، نذر، کفارہ، پردہ، لباس، شوہر اور والدین کے ساتھ حسن معاملہ اور دعا ومناجات
جیسے موضوعات پر سینکڑوں مسائل کو بڑے حکیمان[illegible]م فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے، ان کے

علاوہ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے متعلق کافی وشافی فتوے ہیں، علمائے حجاز کے مسلک کے مطابق ان میں سے کچھ فتوے ایسے ہیں جو عام اردو داں طبقہ کے مسلک سے جدا ہیں، ایسے مقامات پر حاشیہ میں فقہ حنفی کی وضاحت کر دی جاتی تو بہتر ہوتا۔

علامہ سید رشید رضاؒ: از ڈاکٹر ابراہیم احمد عدوی، مترجم جناب مولانا محمد ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۱۱، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: محمد ثناء اللہ عمری ۲۱-۲۳/۵۵۳ فرنچ پٹ، مچھلی پٹنم ۵۲۱۰۰۲، اے۔پی۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جب یوروپی استعمار کا سیاسی و تہذیبی غلبہ عروج پر تھا اس وقت عالم اسلام میں چند ایسی شخصیتیں وجود میں آئیں جنھوں نے کار اصلاح وتجدید کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، علامہ رشید رضا کا شمار انہی مصلحین ومجددین میں ہوتا ہے، اپنے مشہور ہفتہ وار جریدہ ''المنار'' کے ذریعہ انھوں نے عالم عرب بلکہ پورے عالم اسلام کو متاثر کیا، برصغیر میں بھی ان کا نام اجنبی اور غیر مانوس نہیں تھا، علامہ شبلی نے ۱۹۱۲ء میں ندوہ میں دعوت دے کر ان کی دید وشنید کا موقع بھی فراہم کر دیا، لیکن شخصیت اور افکار کی اس اثر انگیزی کے باوجود اردو واہل قلم نے ان سے شایان شان اعتنا نہیں کیا، اسی کوتاہی کی تلافی کی ایک کوشش زیرنظر کتاب ہے، اصلاً یہ ایک مصری اہل قلم کی کاوش ہے لیکن فاضل مترجم نے اس خوبی ومہارت اور شگفتگی وسلاست سے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے کہ اس پر اصل اور طبع زاد کا گمان ہوتا ہے، مشمولات میں سوانح، المنار، تفسیر قرآن مجید شیخ عبدہ کی رفاقت، سیاسی بصیرت اور مجاہدانہ زندگی کے عنوانات نمایاں ہیں جن سے علامہ مصری کی شخصیت کا اچھا مرقع سامنے آجاتا ہے، لیکن ایک زیادہ بہتر حیات رشید کی ضرورت اب بھی باقی ہے، ڈاکٹر احمد ابراہیم عدوی کا تعارف بھی مختصر ہی سہی، ضروری تھا۔

قلمی چہرے: از شورش کاشمیری مرحوم، مرتبہ جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۰، قیمت: درج نہیں، پتہ: مکتبہ شاہد ار ۹ علی گڑھ کالونی، کراچی۔

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری اور ان کے اخبار چٹان کی شہرت اور مقبولیت ایک زمانے

میں قابل رشک تھی، شورش کی تحریر کے بانکپن، طرح داری، خطیبانہ جوش اور تیزی وطراری کا خاص لطف تھا، چٹان میں ان کی اور تحریروں کے علاوہ مشاہیر کی خاکہ نگاری اور چہرہ نویسی کا کالم بڑا دلچسپ ہوتا، زیرنظر کتاب میں ان خاکوں کو جو تعداد میں ۷۰ کے قریب ہیں یکجا کیا گیا ہے، فاضل مرتب نے شروع میں شورش کی شخصیت اور ان کی خاکہ نگاری پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، ان کے مطابق ''کتاب کا ہر چہرہ اپنی شخصیت کے ظاہر کا عکس اور باطن کا آئینہ ہے'' لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان چہروں میں خود خاکہ نگار کا چہرہ زیادہ نمایاں ہے، شدت انفعال اور زودحسی اور وقتی تاثر کے غلبہ نے زاویہ نظر کو جابجا متاثر ومنحرف کیا ہے، یہ بات اور ہے کہ صاحب قلم کا کمال عیب کو ہنر اور ہنر کو عیب بنادے، بعض خاکے انشائے شورش کا اگر عروج ہیں مثلاً مولانا عبد الماجد دریابادی کے متعلق خاکہ تو بعض خاکے صریحاً ہجو کی حد میں آتے ہیں ان کو قلم زد کرنا ہی بہتر تھا، فاضل مرتب کے متوازن مقدمے اور پروفیسر محمد سرور کے پیش لفظ نے قاری کی ہدایت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا ہے جس کے بعد شورش کی انشا کے نشے سے بہکنے کا خطرہ نہیں رہتا۔

سوانح حضرت مولانا محمد عمر پالن پوریؒ: از جناب مفتی محمد پالن پوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۳۶، قیمت: ۸۰ روپے، پتہ: نظامی بک ڈپو، اسٹیشن روڈ، پالن پور گجرات اور مکتبہ وحیدیہ، دیوبند یوپی۔

مولانا محمد عمر پالن پوری، جماعت تبلیغ میں مولانا محمد یوسف اور مولانا انعام الحسن جیسے اکابر جماعت کے ہم پلہ تھے، وہ شاید جماعت کے سب سے اہم مقرر تھے لیکن اس سے بڑھ کر وہ ایسے صاحب دل عالم تھے جن کا شوق علم، تواضع، خاکساری اور دین کی سربلندی کا جذبہ، سلف صالحین کی یاد تازہ کرتا تھا، ان کی پراثر اور لائق تقلید زندگی کی ایک بڑی دل کش تصویر زیرنظر کتاب میں پیش کی گئی ہے، لائق مولف نے دعوت وتبلیغ کی تحریک کے تعارف کے بعد مولانا مرحوم کے سوانح اور تبلیغ کے میدان میں ان کی محنت اور اس کے ثمرات کو سلیقے سے بیان کیا ہے اور قریب نصف کتاب میں مولانا کی تقریروں اور ارشادات وملفوظات کو مرتب کرکے کتاب کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے۔

جہان اقبال: از ڈاکٹر سید معین الرحمن، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت،

مجلد، صفحات ۱۸۵، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶۔میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے کلام، فلسفہ و پیام اور ان کی شخصیت کا مطالعہ و تجزیہ اردو ادب کے محبوب ترین موضوعات میں شامل ہے، اس امتیاز میں غالب کے علاوہ ان کا کوئی اور ہم سر نہیں، زیر نظر کتاب فاضل مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے یونیورسٹیوں کی اقبالی تحقیق کا جائزہ لیا ہے، اس سلسلے میں پاکستان کی یونیورسٹیوں اور ۸۸ تک عام جامعات کی کارکردگی شمار کی گئی ہے، ۹۷ تک کا یہ جائزہ مفید اطلاعات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اقبالیات پر داد تحقیق دینے والوں کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوسکتا ہے، کتاب کے دوسرے حصے میں سید وقار عظیم جسٹس اے رحمان وغیرہ کی کئی تحریروں اور کاوشوں کا ذکر ہے، رشید احمد صدیقی کی اصل دستی تحریر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔

اعجاز سخن: از جناب ابرار نغمی، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۳۲، قیمت: ۶۰ روپے، پتہ: ابرار نغمی مکان نمبر ۶۹، عقب مسجد مرکز والی، قصائی محلہ رائسین، ایم۔ پی اور عزیز بک ہاؤس، ابراہیم پورہ، بھوپال۔

اس مجموعہ غزلیات کے شاعر گو زیادہ مشہور نہیں لیکن تازگی، فکر و جذبہ کی درستگی اور اظہار میں راست گوئی کی خوبیوں سے ان کی انفرادی شان و شناخت کے امکانات روشن ہیں، بزرگ اور استاد شاعر اختر سعید خاں نے شاعر کی بلند خیالی، روایت کی پاسداری اور شاعرانہ بصیرت کی داد دی ہے، یہ تحسین سخن شناس ابرار نغمی کے لیے سند سے کم نہیں

اچھا تھا اک نگاہ جو خود پر بھی ڈالتے   شاید تمہارے پاس کوئی آئینہ نہ تھا

اور

خلوص سجدہ کے ساتھ نغمی ندامتوں کے بھی چند آنسو   عجب نہیں کہ خدائے برتر نوازش بے حساب کر دے

جیسے اشعار پر مشتمل یہ مجموعہ حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

”ع، ص“